Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1976

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی!

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور نہ کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ قدسی اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر دیدۂ دل پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر — بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

(معراجِ انسانیت۔ از پرویز)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ـــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ـــــ ۲ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۹	مارچ سنہ ۱۹۷۶ء	شمارہ ۳

فہرست

۱ - لمعات ــــــــــــــــــــ ۲

۲ - نذرانۂ عقیدت بحضور سرورِ کائنات ــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۹

۳ - زلزلہ کے بعد ڈھاکہ ــــــــــــ ۱۹

۴ - نقد و نظر ــــ (اسلامی قانون کا پانچواں ماخذ) ــــــ (شاہد عادل میانوالی) ــــ ۲۸

۵ - منزل ہے کہاں تیری ! ــــــ (چوہدری عطاء اللہ ایڈووکیٹ - ساہیوال) ــــ ۳۳

۶ - حقائق و عبر ــــ (۱) تربوز نے رنگ پکڑنا شروع کر دیا ! (۲) بڑوں کی بڑی باتیں ! (۳) تیری آواز مکے اور مدینے ! (۴) اسلام میں حزبِ اختلاف کا تصور ! (۵) مصلحتی اسلام - (۶) سوچئے جرم کس کا ہے ؟ (۷) مولانا مودودی اوران کی پیروی کرنے والے کافر اوران سے ملاقاتیں کرنے والے گمراہ ہیں ! (۸) طوائفوں کو کیش میمو رکھنے کی ہدایت - (۹) مشتعل حاجیوں کا کسٹم ہاؤس پر حملہ - ــــ ۴۱

۷ - باب المراسلات ــــ (سزائے جرمانہ ــ ایک غور طلب سوال) ــــــ ۵۴

۸ - دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس ــــــ (شاہد عادل - میانوالی) ــــــ ۵۵

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۷ فروری ۱۹۷۶ء کی صبح، ملک کے قریب قریب تمام اخبارات اس قسم کی شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔

مسجدِ اقصیٰ میں یہودیوں کو عبادت کی اجازت دینا عالمِ اسلام کے خلاف منظم سازش ہے۔

اسرائیل کے مذموم عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلامی ممالک متحد ہو جائیں۔

قبلۂ اوّل کے تقدس کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔

اسرائیل کی مذموم جسارت کے خلاف پاکستان بھر میں یومِ احتجاج منایا گیا۔

ان سرخیوں کے تحت حسبِ ذیل قسم کی خبریں شائع ہوئیں۔

"مسجدِ اقصیٰ میں یہودیوں کو عبادت کی اجازت دئے جانے کے خلاف آج ملک بھر میں یومِ احتجاج منایا گیا۔ نمازِ جمعہ کے اجتماعات میں اور دیگر مقامات پر نام نہاد مملکتِ اسرائیلی کی عدالت کے اس فیصلے کو قطعی غیر قانونی اور ناجائز قرار دیا گیا اور مسلمانوں کے قبلۂ اوّل کی بے حرمتی کی اس جسارت کی سختی سے مذمت کی گئی۔ یومِ احتجاج قومی سیرت کمیٹی کی اپیل پر منایا گیا۔ جس کا اجلاس منگل کے روز وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ تمام بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں اسرائیلی عدالت کے اس فیصلہ کو عالمِ اسلام کے خلاف ایک منظم اور کھلی سازش قرار دیا گیا۔ علماء کرام نے کہا کہ یہودی دراصل مسجدِ اقصیٰ کو مکمل طور پر اپنے عبادت خانہ میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں اور عدالت کی طرف سے حالیہ اجازت محض ابتدائی قدم ہے۔ اس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیے اور انہیں اسرائیلی عزائم کو بھانپ کر انہیں ناکام بنانے کے لئے ایک ٹھوس اور مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئیے۔ حکومتِ پاکستان پر زور دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں تمام اسلامی ممالک سے رابطہ قائم کرے اور مسلمانانِ پاکستان کے احساسات ان تک پہنچائے۔"

(نوائے وقت ۔ ۷ فروری ۱۹۷۶ء)

یہ احتجاج کس بات پر ہے، کس کے خلاف ہے اور کون کر رہا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔ ہزار برس سے ہمارے علماء کرام ہمیں یہ وعظ سناتے رہے کہ یہودی مغضوب علیہ قوم ہے، اور خدا کا ارشاد ہے کہ یہ قیامت تک کہیں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ (حالانکہ خدا نے کہیں ایسا نہیں کہا) وہ اس دعوے کو مسلسل دہراتے رہے، اور یہودیوں نے، دوسری جنگِ عظیم

کے بعد فلسطین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت (اسرائیلی مملکت) کس جگہ قائم کی، اور کن لوگوں کے علی الرغم قائم کی، ذرا اسے بھی ایک نظر دیکھتے جائیے۔ آپ مراکش سے اپنا پہلا قدم اٹھا کر آگے بڑھتے آئیے اور دیکھئے کہ آپ کس طرح مسلسل ایک ایسے خطۂ ارض سے گزرتے چلے آرہے ہیں، جس میں یکے دیگرے، اور ایک دوسرے سے ملحق اور پیوست مسلمانوں کی آزاد مملکتیں واقع ہیں ـــــ مراکش، الجزائر، لیبیا، (ادھر ترکی)، شمالی افریقہ کی دیگر مملکتیں۔ مصر، سعودی عرب، یمن، عراق، اردن، شام، ایران، افغانستان، پاکستان ـــــ دوسری طرف (سابق مشرقی پاکستان، حالیہ) بنگلہ دیش، ملائشیا، انڈونیشیا وغیرہ ـــــ ایک بحر مواج ہے جو یہاں سے وہاں تک متلاطم نظر آتا ہے۔ اس وسیع و عریض خطۂ زمین کے عین قلب میں یہودیوں نے اپنا خنجر گھونپ دیا، اور ساڑھے ستر کروڑ مسلمانوں کی آبادی، ان کا منہ دیکھتے رہ گئی۔ علماء کرام نے حسبِ معمول پھر بہلانا شروع کر دیا کہ یہ محض ایک ہنگامی حادثہ ہے۔ یہودیوں کی مستقل مملکت کبھی قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا ہونا خدا کی وعید کے خلاف ہوگا ـــــ اور یہودیوں نے اپنے پاؤں مستحکم طور پر جمانے شروع کر دیئے۔

۱۹۶۷ء کی عرب۔ اسرائیل جنگ میں یہودیوں نے بیت المقدس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا، تو ساڑھے ستر کروڑ مسلمانوں نے اپنی اپنی آزاد مملکتوں میں "احتجاجات" کی طرح ڈال دی ـــــ ہر مسجد میں، ہر نماز کے بعد دعا کہ خدا یہودیوں کو غارت کرے۔ ہر جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں، باصد آہ و فغاں، گریہ زاری کہ اللہ، اسلام کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے۔ حتیٰ کہ حج کے اجتماع میں، جبلِ رحمت کے دامن میں، دس دس، پندرہ پندرہ لاکھ حجاج کی پُرسوز صدائیں اور غم آلود دعائیں کہ اسرائیل کی "توپوں میں کیڑے پڑیں" ـــــ ادھر یہ احتجاجات، صدائیں اور دعائیں، اور ادھر اسرائیل نے اپنے پنجے اور مضبوطی سے گاڑنے شروع کر دیئے، اور اگست ۱۹۶۹ء کو انہوں نے مسجد اقصیٰ کے ایک حصہ کو جلا کر خاکستر کر دیا ـــــ اس پر ہمارے احتجاجات کی آوازیں اور بلند ہوئیں، جو مسلمان حکومتوں کے ایوانات تک بھی پہنچ گئیں۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں مسلمان سربراہوں کی چوٹی کانفرنس (SUMMIT CONFERENCE) منعقد ہوئی، جس میں (۲۳) مسلم ممالک بطور ممبر شریک ہوئے اور آزادیٔ فلسطین اور عرب لیگ کے نمائندے بطور مبصر شامل ہوئے۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ پہاڑوں کو ہلا دینے اور سمندروں کو پاٹ دینے کے عزائم کا اظہار ہوا، اور آخر میں ایک قرارداد پاس کر کے، سب اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے۔ اس کانفرنس کے بعد، مارچ ۱۹۷۰ء کو، مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس جدہ میں منعقد ہوئی اور دسمبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں، اور فروری ۱۹۷۴ء میں مسلم سربراہوں کی چوٹی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی۔ ان میں ریزولیوشن پاس ہوتے رہے۔ مساجد میں حسبِ معمول دعائیں مانگی جاتی رہیں۔ عرفات کے میدان میں حاجیوں کی گریہ و زاری بھی بدستور

جاری رہی ـــــ اور یہودی اپنے قدم اور مضبوطی سے جماتے چلے گئے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے مسجد ابراہیمیؑ پر قبضہ کر لیا، اور اب (خود اپنی ہی ایک عدالت سے) مسجدِ اقصیٰ میں عبادت کرنے کی قانونی اجازت حاصل کر لی ـــــ اور ہم نے حسبِ معمول پھر یومِ احتجاج منانے اور یہودیوں پر لعنتیں برسانی شروع کر دیں ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

جو قومیں، عمل چھوڑ کر الفاظ سے اپنا جی بہلانا شروع کر دیں، ان کی یہی حالت ہو جاتی ہے ـــــ اسے قرآنِ کریم نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ اور "شاعری" کے متعلق کہا ہے کہ وہ (آسمانی انقلاب کے پیامبر) رسولؐ کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔ اسی شاعری کو خود فریبی کی مقدس اصطلاح میں مذہب پرستی کہا جاتا ہے۔ دین میں انسان، ہر قدم کے بعد کھڑا ہو کر سوچتا ہے کہ جس مقصد کے لیے وہ قدم اٹھایا گیا تھا، وہ حاصل یا قریب الحصول ہوا ہے یا نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا تو وہ خدا کی راہ نمائی کی روشنی میں غور و فکر کرتا ہے کہ اس پروگرام میں کہاں غلطی یا سقم ہے۔ وہ اس کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ ؎

نہ دکھ جائے نہ درماں راس راتے مگر ضبطِ دوا ہے، اور میں ہوں

لیکن مذہب میں انسان اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میرا کام چند الفاظ دہراتے جانا اور رسمی طور پر چند حرکات کیے جانا ہے۔ یہ دیکھنا میرا کام نہیں کہ ان سے کچھ نتیجہ بھی مرتب ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی خود فریبی سے لادینی ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے کہ اس میں انسان (اگر خدائی راہ نمائی سے روشنی حاصل نہیں کرتا تو کم از کم) اپنی عقل و خرد اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے تو سوچتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ مسلمان صدیوں سے اس قسم کی خود فریبی میں گرفتار چلا آ رہا ہے، جس کی وجہ اس کا ہر قدم اُسے تنزل کی طرف لئے جاتا ہے۔

باقی رہیں مسلمانوں کی مملکتیں ـــــ تو ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا انفرادی مفاد سوچتی ہے۔ ملّت کے اجتماعی مفاد سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ اس سیکولرازم کا لازمی نتیجہ ہے جو اس وقت تمام مسلم ممالک میں کارفرما ہے۔ دین کے نظام میں تمام اُمت، ملّتِ واحدہ ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر افریقہ کے صحرا میں کسی حبشی کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو ایران کے ایوانوں میں زلزلہ آ جائے۔ لیکن مذہب میں، ایک ہی مذہب کی پرستار آبادیاں، مختلف قومیتوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہیں، جن میں ہر قوم کے پیشِ نظر اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ خواہ اس کے حصول کے لئے اسے دوسری (ہم مذہب) قوم کا گلا بھی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ اس وقت "امتِ واحدہ" کا دنیا میں وجود نہیں۔ مسلمان اقوام کی مختلف آبادیاں اور مملکتیں ہیں۔ جنہیں ہم "عالمِ اسلام" کہہ کر اپنے آپ کو خوش فہمی میں رکھتے اور ہر حادثہ پر چیخ و پکار شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، تیسری کوئی نہیں ـ یا تو انہیں دین کی بنیادوں پر "اُمتِ واحدہ" کے پیکر میں متشکل ہو جانا چاہیئے ـــــ اور یا اس فریب سے

نکل جانا چاہیئے کہ موجودہ مذہب، ہم میں، ہم پیوستگی کی بنیاد بن سکتا ہے۔ جو مذہب دو فرقوں کو اکٹھے نماز نہیں پڑھنے دیتا، کیا وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا سکتا ہے؟

ایں خیال است و محال است و جنوں

اس (دوسری) صورت میں ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ دنیا میں مختلف قومیں بستی ہیں، جن کے افراد اپنے آپ کو روایتاً مسلمان کہتے ہیں۔ ان قوموں کی اپنی اپنی مملکتیں ہیں۔ جس طرح یورپ میں مختلف قومیں اور ان کی مختلف مملکتیں ہیں، جن کے باشندے اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں۔ جس طرح عیسائیت ان میں وجہِ جامعیت نہیں، اسی طرح ہمارا موجودہ مذہب ہم میں وجہِ جامعیت نہیں۔ وجہِ جامعیت دین ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں ساری اُمت کا ایک مرکز (سنٹرل اتھارٹی) کے تابع، کتابِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ پاکستان، مذہب اسلام کو پھر سے دین میں تبدیل کرنے کے لئے بطور اولیں تجربہ گاہ وجود میں لایا گیا تھا، لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہاں بھی اسلام، مذہب کا مذہب ہی رہا۔ دین نہ بنایا جا سکا۔

لہٰذا، اب قراردادیں پاس کرتے رہو۔ ایام احتجاج مناتے رہو۔ صدائیں بلند کر کے اور دعائیں، مانگ مانگ کر اپنے آپ کو خوش فہمی میں مبتلا رکھو، اور مغضوب علیہ قوم کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے جاؤ کہ یہی خدا کا اٹل قانون ہے۔

پرویز صاحب کا ارادہ ہے کہ وہ اس سال، یومِ اقبالؒ کی تقریب پر "مرکزِ ملت" کے موضوع پر مبسوط خطاب پیش کریں گے۔ اس میں ہمارے پیش کردہ اجمال کی تفصیل مل سکے گی۔

(۲)

قائدِ اعظمؒ کا سال

حکومتِ پاکستان نے ۱۹۷۶ء کو قائدِ اعظمؒ کا سال قرار دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ قوم اب تک تحریکِ پاکستان کے محرکات اور قائدِ اعظمؒ کے نظریات سے بیگانہ چلی آ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے (بالخصوص ہماری نئی نسل کو) ان سے متعارف کرایا جائے۔ کیونکہ یہ مملکت پاکستان کی عمارت کے سنگِ بنیاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد نہایت مبارک و مسعود ہے، اور ہمیں خاص طور پر اس پر چراغاں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن جب ہمارے سامنے اس کمیٹی کے ارکان کی تفصیل آئی جو اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے متشکل کی گئی ہے، تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ یہ اسکیم ایک ایسے ملی نقصان کا موجب بن جائے گی، جس کی تلافی ناممکن ہوگی۔ اس کمیٹی کے فعال قسم کے ارکان وہ ہیں، جنہیں نہ صرف یہ کہ تحریکِ پاکستان کے محرکات اور قائدِ اعظمؒ کے نظریات سے کوئی وابستگی نہیں بلکہ وہ ان کے سخت مخالف چلے آ رہے ہیں — تحریکِ پاکستان کے دوران بھی وہ ان کے مخالف تھے، اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی وہ مختلف

طرق و اسالیب سے اُن کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکت کے ذرائع ابلاغ پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور کبھی سوشلزم کے نام سے، اور کبھی جداگانہ قومیتوں اور مختلف ثقافتوں کے پیرائے میں، سیکولر نظریات کو عام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ سالِ قائداعظمؒ کے پروگرام میں سب سے اہم کڑی تحریکِ پاکستان کی تاریخ کی تدوین، اور قائداعظم کے سوانحِ حیات کی ترتیب ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ جب یہ تاریخ اور سوانحِ حیات ان لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوں گے تو وہ کس قسم کا زہر نہیں پھیلائیں گے! اور پھر اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ چونکہ یہ تصانیف خود حکومت کی زیرنگرانی مرتب ہوں گی، اس لئے انہیں مستند بھی قرار دیا جائے گا۔ اور (اغلباً) انہیں نصابِ تعلیم میں بھی شامل کرایا جائے گا۔ اس سے جو نتائج برآمد ہوں گے ان کی مضرت رسانیوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قوم کی آنے والی نسلیں خالص سیکولرازم کی فضا میں پروان چڑھیں گی اور اس حصۂ مملکت کا انجام وہی ہوگا، جو مشرقی پاکستان کا ہوا! وہ بھی تو بھارت کی گود میں اسی لئے چلا گیا کہ، وہاں سیکولرازم کے خیالات عام کئے گئے تھے۔

اس کمیٹی کے ارکان کے متعلق ہمارا یہ اندازہ ایک بیرونی دور، مبصر کی حیثیت سے تھا۔ لیکن اب اس کی توثیق ایک ایسی شہادت سے ہو گئی ہے جو خالصتاً درونِ خانہ کی ہے۔ یعنی مملکت پاکستان کے وزیرِ داخلہ، خان عبدالقیوم کی شہادت۔ انہوں نے حال ہی میں گوجرانوالہ میں طلباء کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

> قائداعظم کمیٹی میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہیں، جن کا قائداعظمؒ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رہا، اور جو نظریۂ پاکستان کے مخالف ہیں۔ وزیرِ داخلہ نے کہا کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اور اگر نظریۂ پاکستان کو فراموش کر دیا گیا تو ملک کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ انہوں نے سوشلزم کا پرچار کرنے والوں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور کہا کہ یہ لوگ آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہمارے آئین کی بنیاد اسلام پر ہے اور اس میں سوشلزم کا کہیں ذکر نہیں۔
>
> (نوائے وقت۔ اداریہ۔ مورخہ ۸ فروری ۱۹۷۶ء)

اس شہادت کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ حضرات جن کے سپرد تاریخ سازی کا یہ اہم فریضہ کیا جائے گا وہ ہیں جنہیں قائداعظم کی صرف دو باتیں یاد ہیں ـــــ ایک یہ کہ انہوں نے ایک مرتبہ چٹاگانگ میں "اسلامی سوشلزم" کے الفاظ دہرائے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ انہوں نے ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کو اسمبلی کی تقریر میں کہا تھا کہ پاکستان میں ہندو اور مسلمان میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اوّل الذکر سے یہ لوگ قائداعظمؒ کو سوشلسٹ ثابت کرتے ہیں اور ثانی الذکر سے سیکولرازم کے علمبردار ـــــ اس قسم کے خیالات کو انہوں نے ابھی سے عام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دو بنیادی پتھروں پر تاریخ پاکستان کی جو عمارت استوار ہو گی، وہ اس مملکت میں

اسلامی تصور کا خاتمہ کر دے گی۔

ہم اپنی (مسخ شدہ) تاریخ کے ہاتھوں پہلے ہی کافی پٹ چکے ہیں۔ اس ہزار سال کے عرصہ میں مذہب کے نام پر جس قدر خلفشار پیدا ہوئے اور تباہیوں اور بربادیوں کے ہنگامے اٹھے ہیں، ان کی بنیاد اس مسخ شدہ تاریخ پر تھی جس نے (بدقسمتی سے) اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ پاکستان کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم اپنی اس تاریخ کو منزہ شکل میں پیش کر سکیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ اس مملکت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اسلام پر سے وہ چھاپ دور کر سکیں گے جو ملوکیت نے اس پر ثبت کی تھی، تو اس سے ان کا مقصد اس مسخ شدہ تاریخ کی تطہیر بھی تھا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں خود اس مملکت کی ایسی تاریخ مرتب کی جائے گی جو رہے سہے اسلام کا بھی تصور ختم کر دے! یہی صورت ۱۹۷۶ء میں صد سالہ جشن منانے کی اسکیم کے سلسلہ میں پیدا ہو گی۔

وزیراعظم بھٹو اس کمیٹی کے صدر ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی بے پناہ مصروفیتیں انہیں اتنی فرصت دے رہی ہیں یا نہیں کہ وہ اس منصوبہ کے عملی عواقب کی طرف یکسوئی سے توجہ دے سکیں۔ ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر اسے اپنی گہری توجہ کا موضوع قرار دیں۔ اس لئے کہ اس سے جو خدشات مترشح ہوتے نظر آتے ہیں، وہ نہ صرف اسلام اور مملکتِ پاکستان کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوں گے بلکہ ان سے خود ان کی پارٹی بھی بُری طرح متاثر ہوگی۔ قوم کتنی ہی گئی گذری سہی، وہ کبھی اس قسم کی تاریخ کو قبول نہیں کرے گی جو قائداعظمؒ کو سوشلزم یا سیکولرازم کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرے۔ قوم قائداعظم کو صحیح اسلام کا پیامبر سمجھتی ہے (اور بجا طور پر ایسا سمجھتی ہے) اور اسی بنا پر اس کے دل میں ان کا اس قدر احترام ہے۔ وہ ان کی سیرت کو اس طرح داغدار ہوتے کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔

کیا ہم توقع کریں کہ محترم وزیراعظم ہمارے اس مخلصانہ مشورہ کو درخورِ اعتناء قرار دیں گے؟

---

(۲)

پھر وہی "احمدیوں" کا مسئلہ

قارئین طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۵ء کے ص ۲۳ کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیں جس پر ہم نے قادیانی (ربوی) "احمدیوں" کے روزنامہ الفضل بابت ۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء کے صفحۂ اوّل پر شائع شدہ اعلان درج کر کے حکومتِ پاکستان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس مسئلہ کے قانونی عواقب کی وضاحت کرے۔ اس میں انہوں نے اپنے متبعین سے کہا تھا کہ:۔

> ہم اپنے آپ کو احمدی لکھ سکتے ہیں، لیکن غیر مسلم نہیں لکھ سکتے۔ اس بات کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ دستور یا قانون کی اغراض کے لئے ہمیں مسلمان نہیں سمجھا گیا۔ خود ہمیں قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے آپ کو غیر مسلم لکھیں۔ یہ جھوٹ ہوگا، اور یہ عقلاً، قانوناً اور اخلاقاً بھی درست نہیں اور راست گوئی کے بھی خلاف ہوگا۔
>
> اور یہ امر ہر لحاظ سے واضح اور صریح ہے کہ ہم "احمدی مسلمان" ہی کہلا سکتے ہیں۔

ہم نے اتنا ہی نہیں کیا تھا کہ الفضل کے اس اعلان کو اپنے ہاں شائع کر دیا۔ ہم نے پہلے محترم وزیراعظم کی توجہ

اس طرف بذریعہ تار متوجہ کرائی، اور پھر محترم وفاقی وزیر قانون کی خدمت میں تفصیلی خط لکھا۔ ہمیں ان کی طرف سے تو کوئی جواب موصول نہ ہوا، البتہ مئی ۱۹۷۵ء میں ہمیں وزارتِ امور مذہبہ کے تحقیقاتی شعبہ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا کہ انہیں الفضل بابت ۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء کی کاپی دستیاب نہیں ہو رہی۔ اس پر ہم نے انہیں طلوعِ اسلام کا وہ پرچہ بھیج دیا، جس میں الفضل کا اعلان چھپا تھا۔

اس کے بعد جب حکومت کی طرف سے سینیٹ کے ارکان کے لئے حلف نامہ تجویز ہوا اور شناختی کارڈوں کے سلسلہ میں "مذہب" سے متعلق کالم پُر کرنے کی ہدایات شائع ہوئیں تو ہم نے (اگست ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں) پھر اس مسئلہ پر قلم اٹھایا اور حکومت سے تاکید کہا کہ وہ اس امر کی وضاحت کرے کہ "احمدیوں" کا یہ مؤقف کہاں تک درست ہے! اس پر حکومت کی طرف سے کوئی وضاحت ہوئی یا نہیں ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔ (ہمارا خیال ہے کہ حکومت نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی اور معاملہ اسی طرح مبہم کا مبہم پڑا ہے۔)

اب روزنامہ الفضل (ربوہ) نے اپنی تین اشاعتوں (بابت ۲۲ جنوری۔ ۲۷ جنوری اور ۳ فروری ۱۹۷۶ء) میں، اپنے سابقہ اعلان کو پھر دہرایا ہے، اور کہا ہے انہیں قانوناً مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے آپ کو غیر مسلم لکھیں۔

اِدھر یہ ہو رہا ہے، اور اُدھر، جس خدشہ کا ہم نے احتمال کیا تھا اس نے عملی شکل اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ وہ اس طرح کہ سرگودھا میں "احمدی" حضرات اپنی مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہاں کے مقامی (مسلمان) حضرات نے سینئر سول جج کی عدالت میں دعوے دائر کر دیا کہ "احمدیوں" کو اس مسجد کی تعمیر سے روک دیا جائے۔ کیونکہ "قادیانی فرقہ کے لوگ مسجد کی طرز کی عبادت گاہ اور مینار نہیں بنا سکتے۔ اور نہ اپنی اپنے عبادت خانہ کو مسجد کے نام سے پکار سکتے ہیں، اور نہ ہی اذان دینے کے مجاز ہیں۔" اس پر عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا ہے اور "احمدیوں" کے نمائندوں کو جواب دعویٰ کے لئے طلب کر لیا ہے۔ (بحوالہ نوائے وقت بابت ۲۰ جنوری و ۳ فروری ۱۹۷۶ء) اسی اخبار کی ۱۲ فروری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق، موضع چونترا میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہوا ہے، جس پر سول جج راولپنڈی نے مسجد کی تعمیر کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا ہے۔

ان مقدمات کا فیصلہ کیا ہوگا، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی ہم اس وقت اس مسئلہ پر کچھ لکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ مقدمات زیرِ سماعت ہیں، لیکن ہم حکومت کی خدمت میں ایک بار پھر عرض کریں گے کہ ایسے اہم معاملات میں ابہام، اکثر اوقات تخریب رساں نتائج کا موجب بن جایا کرتا ہے۔ اندریں حالات، یہ ضروری ہے (اور نہایت ضروری) کہ حکومت واضح طور پر بتائیے کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دینے کے قانونی عواقب کیا ہیں.....؟

ہمارا خیال ہے کہ حکومت ہم سے متفق ہوگی کہ کسی قسم کا خلفشار، خواہ وہ کسی نام سے ہو، اور کسی نقاب میں، ملک کو کمزور تر کرنے کا موجب ہوتا ہے، جس سے بچنا از بس ضروری ہے۔

نذرانۂ عقیدت

بحضورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

(بتقریبِ سعید عید میلاد النبیؐ)

پرویز صاحب کی قرآنی فکر سے مستفید یا متاثر ہونے والے احباب نے انہیں ایک مفکّر کی حیثیت ہی سے دیکھا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کا اوّلین مقام ایک مفکّر ہی کا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید پر مسلسل غور و تدبّر سے اس کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی، اور اس کے بعد اپنے ماحصلِ فکر کو دلائل و براہین کی رو سے قوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ سرتاسر فکری مقام ہے۔ مفکّرین کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں دماغ ہی دماغ ہوتا ہے، قلب نہیں ہوتا۔ لیکن ان میں ایسے صاحبِ نصیب بھی ملتے ہیں جنہیں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے، قلب اور دماغ دونوں کا بہرۂ وافر عطا ہوتا ہے ــــ پرویز صاحب کا شمار اسی قسم کے اربابِ فکر و نظر میں ہوتا ہے۔ انہیں فطرت کی طرف سے جہاں ذہنِ رسا عطا ہوا ہے، وہاں ان کے سینے میں وہ قلبِ متحرک ہے جو سوزِ محبت سے گداز ہے، اور ان کی یہ محبت ہے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم سے۔ جن احباب کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ حضورِ اکرمؐ کا اسمِ گرامی ان کے لب پر آیا، یا ان کے لئے فردوسِ گوش بنا ہو، اور ان کی آنکھ کے آبگینے سے آنسو نہ چھلک پڑے ہوں۔ انہوں نے خود بتایا ہے (اور متعدد بار اس کا تذکرہ کیا ہے) کہ جب وہ شکوک و شبہات کی وادیوں میں سرگرداں تھے تو جس چیز نے انہیں اسلام سے سرکشی برتنے کی ہلاکت سے بچایا وہ حضورؐ اقدس کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت تھی۔ اس کے بعد جب انہوں نے، علم و بصیرت کی بنیادوں پر قرآن کا دامن تھاما تو ان کی شدید ترین آرزو یہ تھی کہ وہ قرآن کریم کے آئینہ کو سامنے رکھ کر حضورؐ کی سیرتِ طیبہ مرتب کریں اور جب برسوں کی تحقیق و کاوش کے بعد انہوں نے اس کے لئے قلم اٹھایا تو ان پر وجد و کیف کا عجیب عالم طاری تھا ــــ جذباتِ عقیدت و محبت تھے کہ سیلاب کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے جنہیں وہ انتہائی محویت سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کئے جاتے تھے۔ اور اس سفر میں جب وہ اس مقام پر پہنچے جہاں حضورِ اقدسؐ

بزمِ ہستی میں رونق افروز ہوئے تو ان کے جذباتِ شوق کی شدت نقطۂ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ اسی جوش و محویت کے عالم میں انہوں نے وہ باب سپردِ قلم کیا جو "معراجِ انسانیت" میں "صبحِ بہار" کے عنوان سے نکہت بیز و عنبر فشاں ہے۔ ہم "امسال" عید میلادالنبیؐ کی تقریبِ سعید پر اس باب کو بطور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اس کی مختلف سطور زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس بار اسے پورے کا پورا ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ اس میں آپ کو ایک خصوصیت نمایاں طور پر دکھائی دے گی اور وہ یہ کہ جذباتِ عشق و عقیدت کا یہ دریائے پرخروش، کہیں بھی قرآنی ساحلوں سے بیباک نہیں ہوا۔ اور یہی پرویز صاحب کی سب سے بڑی خوبی ہے —— در جنوں از خود نرفتن، کارِ ہر دیوانہ نیست —— اب آپ "صبحِ بہار" کی گل فشانیوں سے کیف اندوز ہوجیئے۔ (طلوعِ اسلام)

صبحِ بہار

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین، گرمی کی شدت سے تمتما اٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب، اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتشدانِ ارضی کے دودکش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لو کی دہشت سے سائے کانپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں۔ خنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ وفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے

اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے، لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے دیرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی امید کی نمی باقی نہیں رہتی، اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی، تو یاس و ناامیدی کے اس انتہائی عالم میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہرریزیوں سے دامنِ ارض کو بھرپور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آ جاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں، بادۂ جانفزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جاں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں، کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آ جاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں، کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے، سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا ——— بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں ——— ہر طرف ایک نئی زندگی، اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ، جھومتی، مسکراتی، مچلتی، لوٹتی، ایک ایسی جنت نگاہ بن جاتی ہے جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی ناامیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ؕ حَتّٰى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۔ (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر، جب وہ ہوائیں پانی کے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اٹھتی ہیں تو خدا کا قانون انہیں زمینِ مردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے، اسی زمینِ مردہ سے، ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

فَانْظُرْ إِلٰى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ (۳۰/۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت

کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے، جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں۔ یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آیئے، اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں شدید و مہیب تھی، جس کا تشبیہی منظر اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر ختم ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے۔ لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نا امید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے اس ربّ المنن کا سحابِ کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اطہر و اعظم

کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی، جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرفِ مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے۔ جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ فرمانی و حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے۔ جہاں غیب و شہود کی وادیاں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ نوامیسِ فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالع بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا۔ جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (۳۳/۴۵-۴۶)

وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ:

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)

جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصری و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں۔ تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامیؐ کہ ؎

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش بندۂ آمد و لیکن!
جہانِ شوق را پروردگار است
اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ج (۳۰/۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اسی حقیقت باہرہ کو باندازِ دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں، کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھا جو نگارخانۂ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لئے پیغامِ ازلی تھا جو مبداءِ فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ خود بیں طبیعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر، اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں۔ اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب رد و بدل اور ضروری تغیر و تبدّل ہوتا جاتا تھا، تاکہ طبیعی ارتقا کے ساتھ ساتھ، جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج ارتقا ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کاروان سوئے منزل جادہ پیماں تھا۔ ان پیغام بَرانِ حیاتِ جاوید کا ہر قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تامّل و توقف اس کے پیچھے ہو لے، اور راہ گم کردہ، مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زرّیں کی مختلف کڑیاں تھیں۔ جن میں کی ہر کڑی، سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سرسبد کے لئے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیّتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آ گئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آ گیا، جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشاد پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر راز ہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گوہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آ گئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ

سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ پہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلدامین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی۔ جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں، اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا، سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ و سلام کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی، اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ کافۃ للناس اور رحمۃ اللعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام، اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی۔ اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی۔ وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبیؐ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی، جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمانؐ کے مقدس ہاتھوں سے محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندیٔ جہاں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے شائق گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا، وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا، شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت رہی، نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق، دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

یہ تھا حاملِ بہارِ چمنِ کائنات، کہ جس کا ظہور، صبحِ بہارِ کائنات تھا۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حسنِ ازل، وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دوجہاں وہ محمدِ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درودِ لامحدود!

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۳۳/۵۶)

گہرہائے تابدار

(چند احادیثِ مقدسہ، جو طلوعِ اسلام کے ٹائٹل پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں)

○ رسول اللہؐ نے وفات کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ نہ درہم نہ دینار۔ نہ غلام نہ لونڈی۔ نہ کوئی اور شے۔

صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار - اور کچھ زمین جسے عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔
(بخاری)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا — ہمارا کوئی وارث نہیں - جو چھوڑا ہے، وہ عام مسلمانوں کے لئے ہے۔
(بخاری)

○ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ——— رسول اللہؐ نے فرمایا کہ
عنقریب فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے - جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا، ہلاک کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا - اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔
(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی - دارمی)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی - سو جب کوئی حدیث میری طرف سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو - جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو - جو اس کے خلاف ہو، اسے رد کر دو۔
(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح صفحہ ۴۸۰)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ ہی کے ہیں - اس لئے زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے - کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔
(کتاب الاموال)

○ (امام بخاریؒ) عبدالعزیز بن رفیعؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقلؓ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقلؓ نے ان سے دریافت کیا — "کیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟" انہوں نے جواب دیا۔ "آپ نے ماہین الدفتین (یعنی مجلد قرآن مجید) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔" عبدالعزیز بن رفیعؓ کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن الحنفیہؓ کی خدمت میں پہنچے - اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی - انہوں نے کہا۔ "آپ نے ماہین الدفتین کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"
(صحیح البخاری - جلد سوم - صفحہ ۱۴۳ - مطبوعہ بھیۃ مصریہ)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا ——— میرے ورثاء میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہ ہوگا - میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی خوراک کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہوگا۔
(بخاری جلد ۴ - کتاب الفرائض)

○ رسول اللہؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں فرمایا — میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں، جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے — وہ چیز کتاب اللہ ہے۔ (مسلم - نسائی - ابوداؤد)

○ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینہ میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانوں کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔ اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے ——— رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ (بخاری، مسلم)

○ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا، اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا، جس کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اس شخص کو دیدے، جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ ضرورت سے زیادہ ہو اسے دیدے جس کے پاس نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

(مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نوویؒ)

○ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ ہر نبی کو، بقدر ان لوگوں کے جو اس پر ایمان لائے، معجزے دیئے گئے۔ لیکن میرا معجزہ تو وحی (قرآن) ہے۔ جو خدا نے مجھ پر بھیجی ہے۔ (چونکہ یہ معجزہ دائمی، اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے) اس لئے مجھے امید ہے کہ سب انبیاء سے زیادہ قیامت کے روز میری امت ہوگی۔

(بخاری جلد سوم۔ باب فضائل القرآن)

○ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی، جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو امیر بنا دیا جائے، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق چلائے، اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

(بخاری)

○ فرمایا کہ مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو، اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو، وہ اسے مٹا ڈالے۔

(مسلم)

○ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا۔

(مسند امام احمد)

(وہ ہے "معراجِ انسانیت" کا مصنف پرویز جسے "منکرِ شانِ رسالت" بتایا جاتا ہے۔ اور یہ ہے وہ طلوعِ اسلام جسے "منکرِ حدیث" قرار دیتے ہوئے "صالحین" کی زبانیں نہیں سوکھتیں!)

زلزلہ ــــ کے بعد ــــ دھماکہ

طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۷۶ء میں "مغرب دین ــــ دیوبندی نقطۂ نگاہ سے" کے زیر عنوان ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں "زلزلہ" نامی ایک کتابچہ سے، دیوبندی حضرات کے عقائد کی چند ایک تفاصیل پیش کی گئی تھیں۔ اس کی تمہید میں ہم نے لکھا تھا کہ:۔

> یہ عقائد اس فرقہ (دیوبند) کے ہیں، جنہیں بریلوی حضرات "وہابی" کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اس بات کا اندازہ لگا لیجئے کہ جب "وہابیوں" کے یہ عقائد ہیں تو جنہیں (بریلوی حضرات کو) دیوبندی، "بدعتی" کہتے ہیں، ان کے عقائد کس قسم کے ہوں گے۔

اس کے بعد ہمیں ایک اور کتابچہ موصول ہو گیا۔ جس کا نام ــــ دھماکہ ــــ ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ بریلوی حضرات کے عقائد کس قسم کے ہیں۔ ہم اس کتابچہ سے بھی چند ایک اقتباسات پیش کر دینے پر اکتفا کرتے، لیکن اس کتابچہ کے "تعارف" سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ "انفرادی جہاد" نہیں۔ یہ دو تحریکیں ہیں، جن کا (خیر سے) سرچشمہ انگلستان ہے، اور وہاں یہ دونوں بڑے زور شور سے دین کی "خدماتِ عالیہ" میں مصروف ہیں۔ کتابچہ "زلزلہ" اولاً انگلستان سے، بریلوی فرقہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ پھر وہ بھارت میں چھپا، اور اس کے بعد پاکستان میں شائع ہوا ــــ زیر نظر کتابچہ بھی اولاً انگلستان میں [انجمن خدام التوحید و السنۃ، برمنگھم کی جانب سے] شائع ہوا، اور پاکستان میں اسے، "انجمن خدام التوحید والسنۃ، ساہیوال" نے شائع کیا ہے۔ ہمارے سامنے ہر دو مقامات سے شائع شدہ کتابچے کے نسخے ہیں۔ آپ پہلے وہ تعارف ملاحظہ فرمائیے جو برمنگھم سے شائع شدہ کتابچہ میں درج ہے:۔

"یہاں زیادہ تر مزدور طبقے کے لوگ ہیں، جو مصروف ہیں اور انتہائی مصروف ــــ ان کے پاس فرقہ پرستی کے بندھنوں اور مذہب کے جھگڑوں کے لئے وقت نہ تھا، اور نہ وہ چاہتے تھے کہ یہاں فرقہ بندی کی فضا پیدا ہو ــــ مگر افسوس کہ چند فرقہ پرستوں نے یہاں بھی دھندا کاروبار کھول لیا، جس سے لوگ اپنے ملکوں میں بھی تنگ آئے ہوئے تھے۔ پیرانِ عظام کی ایک قطار لگ گئی۔ سونا دگنا ہونے لگا۔ مولانا احمد رضا خاں کے پوتے اپنے دادا کی تکفیری داستانیں لے کر یہاں پہنچے۔ مولوی محمد احمد کا

کو دعوت دی گئی، وہ فوت ہو گئے، ان کا لڑکا آ گیا۔ بھارت سے دو مولوی آئے۔ جنہوں نے اماکنِ مقدسہ کی حفاظت کے عنوان سے بریلوی مذہب کا تکفیری ادارہ "ورلڈ اسلامک مشن" قائم کیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر وہاں کے اماموں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کی تلقین کی، لوگوں کو بتایا کہ سعودی عرب پر کفار کا قبضہ ہے۔ وہابیہ نجدیہ سب کافر اور مرتد ہیں۔ نہ ان کی نماز، نماز ہے۔ نہ ان کے پیچھے نماز، نماز۔

۱۹۷۴ء میں طے کیا گیا کہ بھارت کے ان مولویوں کے ساتھ صدر پاکستانی ہو، جو حکومتِ پاکستان کے خلاف کام کر سکے۔ مولانا شاہ احمد نورانی اس مشن کے صدر مقرر ہوئے۔ مولانا اپنے ایک لڑکے کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں بھی انگلستان آئے۔ ان کے ساتھ کرایہ پر لایا ہوا ایک مولوی بریلوی مذہب سے اختلاف رکھنے والوں کو برسرِ عام سٹیجوں سے بدنام کرتا رہا۔ مولانا نورانی اس خدمتِ اسلام پر خوش تھے اور ان کی خاموشی اس ستم کار کو دادِ ستم دیتی رہی۔ مولانا نورانی نے بریڈ فورڈ کی ایک مجلس میں افغانستان سے تعاون لینے کا بھی اشارہ دیا۔

سعودی عرب کے خلاف ورلڈ اسلامک مشن کی سرگرمیاں شروع سے تیز تھیں۔ حکومتِ پاکستان کی مخالفت مولانا نورانی کی آمدِ ثانی سے شروع ہوئی۔ روزنامہ ملت لندن کی اطلاع کے مطابق ورلڈ اسلامک مشن کے جنرل سیکرٹری نے بریڈ فورڈ کی ایک مجلس میں پچھلے سال ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

> "شاہ فیصل کو پاکستان اور عالمِ عرب خواہ مخواہ اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ نجدی وہابی ہیں، جو وہابیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹ جانا چاہیئے یا اسے ختم کر کے کسی دوسرے اچھے عرب کو لانا چاہیئے۔"

روزنامہ ملت لندن ۲۹ اپریل

اس کے ساتھ ہی بھارت کے ماہنامہ "المیزان" بمبئی نے جو سید محمد مدنی میاں کی سرپرستی میں نکلتا ہے، اعلان کر دیا تھا کہ وہابیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ (المیزان ص۱۱ دسمبر ۱۹۷۴ء)

جلالۃ الملک شاہ فیصل مرحوم کی شہادت سے لوگ جاگ پڑے، ہر جگہ پوچھنے لگے کہ بریلوی مذہب کیا ہے؟ جو لوگ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر کافروں کا قبضہ بتلاتے ہیں، ان کا اپنا تعارف کیا ہے؟ اس قسم کے سوالوں کا جواب آپ کو اس رسالہ میں ملے گا۔ اس میں جو عقائد اور نظریات درج ہیں وہ سُنّی نظریات نہیں بریلوی مذہب کی تفصیلات ہیں۔"

اور اس کے بعد وہ "گذارشِ احوالِ واقعی" جو ساہیوال سے شائع شدہ کتابچہ کی ابتدا میں مندرج ہے، یہ ہے۔

"ایک فرقہ جو صرف برصغیر کی حد تک پایا جاتا ہے، فرقہ بریلوی یا رضا خانی کے نام سے معروف ہے جس کے بانی تحریکِ استخلاصِ وطن کے زمانے میں مجاہدینِ اسلام اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے کو کافر قرار دینا جزوِ ایمان سمجھتے تھے اور "وہابی" کے لفظ سے انگریز نے جو نفرت پھیلانے کا منصوبہ

بنایا تھا اس کی تکمیل ان کا مقصدِ حیات تھی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت، بہرحال اسی "گروہ مقدسہ" سے متعلقہ افراد نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل کو پھر ایک نئے انداز سے ہوا دی ہے اور ایک بزرگ ارشد القادری صاحب جو "علامہ" بھی کہلاتے ہیں نے ایک کتاب بنام "زلزلہ" لکھی، جو ہندوستان میں چھپی، برطانیہ پہنچی اور اب "افادۂ عام" کے لئے پاکستان میں اس کی اشاعت عام ہو رہی ہے۔ (خدا جانے یہ لوگ تعمیری اور مثبت کام کرنا کیوں پسند نہیں کرتے۔ خیر سے ان کو سوادِ اعظم ہونے کا بھی دعویٰ ہے۔ لیکن اس پندار کا نتیجہ حال ہی میں لاہور کے ضمنی انتخاب میں جہاں ڈیڑھ لاکھ میں سے صرف دو ہزار افراد نے ان کے حق میں اپنی رائے کا استعمال کیا ہے ظاہر ہو گیا ہے۔ شاید اب یہ نشہ ہرن ہو گیا ہو۔) ارشد القادری صاحب کا ہیڈ کوارٹر آج کل بریڈ فورڈ انگلینڈ میں ہے۔ اور انگلینڈ میں مسلکِ حقہ کی ایک جماعت جسے "تبلیغی جماعت" کہا جاتا ہے کے کافی اثرات ہیں۔ الحمدللہ تبلیغی دوستوں کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت صنم کدۂ یورپ میں صحیح الخیال اور متشرع بکثرت موجود ہیں جن کی موجودگی "علامہ ارشد القادری" کو قطعاً نہ بھائی اور فوراً تبلیغی جماعت کے خلاف ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اسی طرح ایک کتاب جماعتِ اسلامی کے خلاف بھی لکھی۔ یہ تینوں کتابیں ہندوستان میں شائع ہوئیں، تاکہ غلام مسلمان سیاسی طور پر منظم نہ ہو سکیں۔ یہ اسی اندازِ فکر کی صدائے بازگشت ہے جو غلام ہندوستان میں لگائی گئی کہ انگریز کے خلاف جدوجہد نہ کرو اور اس کے خلاف کام کرنے والی ہر سیاسی جماعت کو کافر کہو (حوالے آگے دیکھئے) سالِ گزشتہ جب پاکستان کے مسلمان سازشِ نبوت کے خلاف نبرد آزما تھے اور پوری قوم ابتلاء اور آزمائش کے دور سے گزر رہی تھی۔ یادش بخیر جناب مولانا شاہ احمد نورانی صاحب "تبلیغِ اسلام" کے لئے بیرونِ ملک تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ ایک "خان صاحب" بھی تھے جنھوں نے انگلستان میں ایسی مسموم اور فرقہ وارانہ تقریریں کیں جس کا نتیجہ گزشتہ رمضان میں یہ ظاہر ہوا کہ برطانیہ کی سب سے بڑی نوتعمیر جامع مسجد برمنگھم میں ایسا فساد برپا ہوا کہ انگریز پولیس نے خانۂ خدا سے مخلوقِ خدا کو نکالنے کے لئے کئی چھوڑے اور نتیجتاً مسجد مقفل کر دی گئی ؎

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے میرے گھر کے چراغاں نے مجھے

پاکستانی پریس نے بوجوہ اس خبر کو شائع نہیں کیا۔ لیکن گزشتہ دنوں مولانا شاہ احمد نورانی کی سیٹ پر کراچی میں جو الیکشن ہوا، وہاں پیپلز پارٹی کے مایۂ ناز خطیب اور وزیر امورِ مذہبی نے اس واقعہ فاجعہ کا انکشاف کیا۔[1]

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، انگلستان میں مقیم ایک قرآنی رفیق کا

---

[1] اور اپنی مایۂ ناز خطیب کا ارشاد یہ بھی ہے کہ یہ "مذہبی فرقے" نہیں "مکاتبِ فکر" ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

خط شائع کیا تھا، جس میں انہوں نے ان فرقہ وارانہ تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے برمنگھم کی زیرِ تعمیر مسجد کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ اس گزارشِ احوالِ واقعی سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس مسجد کا کیا حشر ہوا؟ یہ ہیں دین کی وہ خدمات جو یہ دین کے علمبردار فرقے' کفار کی سرزمین (انگلستان) میں سرانجام دے رہے ہیں ___ بعض حضرات اس بات پر اظہارِ تعجب کرتے ہیں کہ یہ لوگ، پاکستان کو چھوڑ کر، انگلستان کو اپنے دنگل کا اکھاڑہ کیوں بنا رہے ہیں، جس سے اسلام، غیروں کی نظروں میں اضحوکہ بن رہا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انگلستان (یا دیگر بیرونی ممالک) میں بسنے والے مسلمان نسبتاً زیادہ خوشحال ہیں۔ دوسرے وطن سے دور جا کر، انسان کے جذبات بھی زیادہ رقیق اور نازک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان "ہریالے چگ" حضرات کے لئے وہاں کی کھیتیاں بڑی پُرکشش ہوتی ہیں۔ یہ وہاں جاتے ہیں اور جھولیاں بھر بھر کر فتوحات لاتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ان کی اس قسم کی حرکات سے اسلام بدنام ہوتا ہے، تو انہیں اسلام سے واسطہ کیا ہے، جو اس کی حمیت اور غیرت کا جذبہ ان کا دامن گیر ہو۔ اسلام ان کا کاروبار یا (PROFESSION) ہے۔ اور ہر کاروباری کی طرح اپنے کاروبار کی کامیابی ان کا مقصد ہوتا ہے، خواہ اس کے لئے کوئی حربہ اختیار کرنا پڑے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد، ایک جھلک، بریلوی حضرات کے ان عقائد کی دیکھئے جو اس کتابچہ میں مذکور ہیں۔ واضح رہے کہ ہم اپنے اندر اس کی جرأت نہیں پاتے کہ جو کچھ اس کتابچہ میں درج ہے' وہ سب کا سب سامنے لایا جا سکے۔ ہم اس میں سے صرف اتنا حصہ پیشِ قارئین کرتے ہیں جو قابلِ برداشت ہے ___ اور وہ بھی دل پہ پتھر رکھ کر، خون کے آنسو بہاتے ہوئے۔

(ہم نے حوالے' ساہیوال سے شائع ہونے والے کتابچہ کے دیئے ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا احمد رضا خان مرحوم، بریلوی فرقہ کے بانی تھے)۔

۱۔ دیوبندیوں کی تکفیر

"جو شخص وہابیہ دیوبندیہ کے کفر میں شک کرے، اس کے بارے میں احمد رضا خان فرماتے ہیں":

بلاشبہ اس سے دور بھاگنا اور اسے اپنے سے دور کرنا اس سے بغض اس کی اہانت اس کا رد فرض ہے اور توقیر حرام و ہدم اسلام۔ اسے سلام کرنا حرام۔ اس کے پاس بیٹھنا حرام۔ اس کے ساتھ کھانا پینا حرام، اس کے ساتھ شادی بیاہ حرام اور قربت زنا خالص اور بیمار پڑے تو اسے پوچھنے جانا حرام۔ مر جائے تو اس کے جنازے میں شرکت' اسے مسلمانوں کا سا غسل و کفن دینا حرام۔ اس پر نماز جنازہ پڑھنا حرام بلکہ کفر۔ اس کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھانا' اس کے جنازے کی مشایعت حرام۔ اسے مسلمانوں کے مقابر میں دفن کرنا حرام۔ اس کی قبر پہ کھڑا ہونا حرام۔ اس کے لئے دعائے مغفرت یا ایصالِ ثواب حرام بلکہ کفر۔ (عرفانِ شریعت۔ صفحہ ۳۹) (کتابچہ صفحہ ۲)

۲۔ سب کی تکفیر

وہابی رافضی قادیانی وغیرہم کفار مرتدین کے جنازہ کی نماز انہیں ایسا جانتے ہوئے پڑھنا کفر ہے۔ (ملفوظات حصہ اول صـ۸۲)

رافضی تبرائی وہابی دیوبندی وہابی غیر مقلد قادیانی چکڑالوی نیچری ان سب کے ذبیحے محض نجس و مردار قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نام الٰہی لیں اور کیسے ہی متقی پرہیزگار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ (احکام شریعت حصہ اول صـ۱۲۲)

نہ ان کی نماز نماز ہے، نہ ان کے پیچھے نماز نماز۔ بالفرض وہی جمعہ یا عیدین کا امام ہو اور کوئی مسلمان امامت کے لئے نہ مل سکے تو جمعہ و عیدین کا ترک فرض ہے۔
(احکام شریعت حصہ اول صـ۱۲۹)

عرض:۔ وہابیوں کی بنوائی ہوئی مسجد، مسجد ہے یا نہیں؟

ارشاد:۔ کفار کی مسجد مثل گھر کے ہے۔ (ملفوظات حصہ اول صـ۱۱۸)

آج کل کے روافض تو عموماً ضروریات دین کے منکر اور قطعاً مرتد ہیں۔ ان کے مرد یا عورت کا کسی سے نکاح ہو سکتا ہی نہیں۔ ایسے ہی وہابی قادیانی دیوبندی نیچری چکڑالوی جملہ مرتدین ہیں کہ ان کے مرد یا عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہو گا مسلم ہو یا کافر اصلی یا مرتد انسان ہو یا حیوان، محض باطل اور زنا خالص ہو گا، اور اولاد ولد الزنا۔ عالمگیریہ میں ظہیریہ سے ہے۔ احکامہم احکام المرتدین۔
(ملفوظات حصہ دوم صـ۱۰۰) (کتابچہ صـ۱۳)

۳۔ مسلم لیگ۔ اقبالؔ۔ جناحؔ کی تکفیر

(۱) حزب الاحناف، لاہور کے مولوی ابوالبرکات سید احمدؒ کا فتویٰ:۔

لیگ کی حمایت کرنا۔ اس میں چندے دینا۔ اس کا ممبر بننا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا۔ منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔ (رسالہ الجوابات السنیہ صـ۳۲-۲۹)

(۲) علامہ اقبالؔ کے متعلق ارشاد ہے:۔

ڈاکٹر صاحب کی زبان پر شیطان بول رہا ہے ——— اگر ان اعتقادات کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی اور اسلام گھڑ لیا ہے۔ (تجانب اہل السنۃ صـ۳۴۱ و صـ۳۴۵) (کتابچہ صـ۱)

۱؎ اب اسی مسلم لیگ کے ساتھ مولانا شاہ احمد نورانی اتحاد کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور مسلم لیگ انہیں سینے سے لگا رہی ہے۔ (طلوع اسلام)

(۳) قائدِ اعظمؒ کے متعلق ارشاد ہے:-

بحکمِ شریعت مسٹر جناح اپنے عقائدِ کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بناء پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اسے مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر مرتد ہے۔ (تجانب اہل السنۃ صفحہ ۱۲۲) (کتابچہ صفحہ ۱۸)

۴ - اب عقائد کی طرف آئیے!

بریلوی حضرات کے نزدیک مُردوں کا زندوں کے ساتھ ربط و ضبط باقاعدہ قائم رہتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:-

ایک بی بی نے مرنے کے بعد خواب میں اپنے لڑکے سے فرمایا کہ میرا کفن ایسا خراب ہے کہ مجھے اپنے ساتھیوں میں جاتے شرم آتی ہے۔ پرسوں فلاں شخص آنے والا ہے، اس کے کفن میں اچھے کپڑے کا کفن رکھ دینا۔ صبح کو صاحبزادے نے اُٹھ کر اس شخص کو دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ بالکل تندرست ہے اور کوئی مرض نہیں۔ تیسرے روز خبر ملی کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ لڑکے نے فوراً نیا عمدہ کفن سلوا کر اس کے کفن میں رکھ دیا اور کہا کہ یہ میری ماں کو پہنچا دینا۔ رات کو وہ صالحہ خواب میں تشریف لائیں اور بیٹے سے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے تم نے بہت اچھا کفن بھیجا۔ (ملفوظات مولانا احمد رضا خان حصہ اوّل صفحہ ۲۰) (کتابچہ صفحہ ۲۱)

۵ - مریدوں کی مدد

اولیائے کرامؒ اپنے مریدوں کی کس کس انداز سے مدد فرماتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے!:-

حضرت سیدی عبدالوہاب اکابر اولیاء کرام میں سے ہیں۔ حضرت سیدی احمد کبیر بدوی کے مزار پر بڑا میلہ اور ہجوم ہوتا تھا۔ اس مجمع میں چلے آتے تھے۔ ایک تاجر کی کنیز پر نگاہ پڑی۔ فوراً نگاہ پھیر لی کہ حدیث میں ارشاد ہوا النظرۃ الاولیٰ لک و الثانیۃ علیک پہلی نظر تیرے لئے ہے اور دوسری تجھ پر، یعنی پہلی نظر کا کچھ گناہ نہیں اور دوسری کا مواخذہ ہوگا۔ خیر نگاہ تو پھیر لی مگر وہ آپ کو پسند آئی، جب مزار شریف پر حاضر ہوئے ارشاد فرمایا۔ عبدالوہاب وہ کنیز پسند ہے؟ عرض کی ہاں۔ اپنے شیخ سے کوئی بات چھپانا نہ چاہیئے۔ ارشاد فرمایا اچھا ہم نے تم کو وہ کنیز ہبہ کی۔ اب آپ سکوت میں ہیں کہ کنیز تو اس تاجر کی ہے اور حضور ہبہ فرماتے ہیں۔ معاً وہ تاجر حاضر ہوا، اور اس نے وہ کنیز مزار اقدس کی نذر کی۔ خادم کو

اشارہ ہوا، انہوں نے آپ کی نذر کر دی۔ ارشاد فرمایا، عبدالوہاب اب دیر کاہے کی فلاں حجرہ میں لے جاؤ، اور اپنی حاجت پوری کرو۔ (ملفوظات حصہ سوم ص۲۸) (کتابچہ ص۲۳)

۶۔ حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ)

انبیاء علیہم السلام کی قبور مطہرہ میں ازواج مطہرات پیش کی جاتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ شب باشی فرماتے ہیں۔ (ملفوظات اعلیٰ حضرت۔ حصہ سوم ص۲۸) (کتابچہ ص۲۴)

جماعتِ اسلامی کے بانی تو جنت میں، کفار کی کم سن لڑکیوں کو نوخیز بنا کر، مومنین کو "پک نک" منانے کے لئے، پیش کرتے ہیں۔ یہ حضرات ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں! ——— آہ، بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

۷۔ حضرت غوثِ اعظمؒ کے متعلق

(۱) "مولانا احمد رضا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف نسبت کر کے لکھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

آفتاب طلوع نہیں کرتا، جب تک مجھ پر سلام نہ کرے۔ نیا سال جب آتا ہے، مجھ پر سلام کرتا ہے اور مجھے خبر دیتا ہے کہ جو کچھ اس میں ہونے والا ہے۔ اسی طرح نیا مہینہ، نیا دن مجھ پر سلام کرتے اور مجھے ہر ہونے والی بات کی خبر دیتے ہیں۔ (الامن و العلیٰ ص۱۲۴) (کتابچہ ص۳۳)

(۲) آپ کی کرامت

"سوانح حیات اعلیٰ حضرت بریلوی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت غوثِ پاکؒ اپنی مسجد میں وعظ فرما رہے تھے۔

ابھی وعظ فرما ہی رہے تھے کہ پانی برسنے لگا، سننے والے کچھ پریشان ہونے لگے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے رب سے عرض کیا کہ اے رب العزت میں تو تیرا اور تیرے محبوب کا ذکر سنا رہا ہوں اور تو پانی برسا کر سننے والوں کو پریشان کر رہا ہے؛ لکھا ہے کہ آپ کا اتنا فرمانا تھا کہ مسجد کے چاروں طرف شدت کی بارش ہوتی رہی مگر مسجد میں ایک قطرہ پانی کا نہیں آتا تھا۔ (سوانح حیات اعلیٰ حضرت بریلوی ص۱۳۲) (کتابچہ ص۴۰)

۸۔ رسول اللہؐ مقتدی اور اعلیٰ حضرت امام (معاذ اللہ)

"مولانا احمد رضا خان (برکات احمد کی وفات کے سلسلہ میں) ارشاد فرماتے ہیں:۔

جب اُن کا انتقال ہوا، اور میں دفن کے وقت ان کی قبر میں اترا، مجھے بلا مبالغہ وہ

خوشبو محسوس ہوئی جو پہلی بار روضہ انور کے قریب پائی تھی۔ ان کے انتقال کے دن مولوی سید امیر احمد صاحب مرحوم خواب میں زیارت اقدس حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے کہ گھوڑے پر تشریف لئے جاتے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ کہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ فرمایا برکات احمد کے جنازہ کی نماز پڑھنے ـــــ الحمد للہ یہ جنازہ مبارکہ میں نے پڑھایا۔ (ملفوظات حصہ دوم ص۲۳) (کتابچہ ص۲۷)

۹۔ مقامِ اولیاء

(۱) "ایک دفعہ حضرت جنید بغدادیؒ دریائے دجلہ کو زمین کی طرح پار کر رہے تھے اور اللہ، اللہ کہہ رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر ایک اور شخص نے اسی طرح دریا پار کرنے کی استدعا کی۔ اس پر مولانا احمد رضا خان لکھتے ہیں"۔

فرمایا یا جنید یا جنید کہتا چلا آ۔ اس نے یہی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا۔ جب بیچ دریا کے پہنچا شیطان لعین نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضرت خود تو یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا جنید کہلواتے ہیں، میں بھی یا اللہ کیوں نہ کہوں۔ اس نے یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا۔ پکارا، حضرت میں چلا۔ فرمایا وہی کہہ یا جنید یا جنید جب کہا دریا سے پار ہوا۔ (ملفوظات حصہ اول ص۱۱۷) (کتابچہ ص۵۱)

(۲) "مولانا احمد رضا خان صاحب سے پوچھا گیا کہ اولیاء کرام ایک وقت میں چند جگہ حاضر ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ تو آپ نے یہ نہیں کہا کہ خدا چاہے تو ایسا ہو سکتا ہے۔ بلکہ فرمایا"۔

اگر وہ چاہیں تو ایک وقت میں دس ہزار شہروں میں دس ہزار جگہ کی دعوت قبول کر سکتے ہیں۔ (ملفوظات حصہ اول ص۱۲۷) (کتابچہ ص۶۶)

۱۰۔ قرآن کے متعلق مبلغِ علم

مولانا احمد رضا خان صاحب کا ارشاد ہے:۔

داڑھی منڈوانے اور کٹروانے والا فاسق معلن ہے۔ اسے امام بنانا گناہ ہے۔ فرض ہو، یا تراویح۔ کسی نماز میں اسے امام بنانا جائز نہیں۔ حدیث میں اس پر غضب اور ارادۂ قتل وغیرہ کی وعیدیں ہیں اور قرآنِ عظیم میں اس پر لعنت ہے۔

(احکامِ شریعت حصہ دوم ص۱۷۳) (کتابچہ ص۷۵)

ہم اس ضمن میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ایسا کہیں نہیں لکھا۔

۱۱۔ آپ کی وصیّت

کتابچہ کے صفحہ ۱۹ پر لکھا ہے کہ مولانا احمد رضا خان صاحب نے اپنی وفات سے ۲ گھنٹے ۱۷ منٹ پہلے

اپنے اعزہ کو جو وصیتیں کیں، ان میں بارھویں نمبر پر حسب ذیل وصیت ہے :-

اعزہ سے اگر بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ، ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگر بھینس کا دودھ ہو۔ مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ خواہ بکری کا ہو۔ شامی کباب پراٹھے اور بالائی۔ فیرینی۔ ارد کی پھریری دال معہ ادرک و لوازم۔ گوشت بھری کچوریاں۔ سیب کا پانی۔ انار کا پانی سوڈے کی بوتل۔ دودھ کا برف۔ (وصایا شریف ص۳ مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور) (کتابچہ ص۱۹)

یہ ہیں مختصر سی جھلکیاں بریلوی حضرات کے ان عقائد کی جن کا ذکر زیر نظر کتابچہ (دھماکہ) میں آیا ہے۔ ہم ان پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، بجز اس کے کہ کیا اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ حضرات (بریلوی ہوں یا دیوبندی) اس قسم کے اعتقادات کے بعد، اس اسلام کی طرف آ سکتے ہیں جسے خدا تعالیٰ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دنیا کو دیا تھا اور جواب اس کی کتابِ عظیم میں محفوظ ہے؟

اور اس کے ساتھ ہی ایک بات اور.....؟

کیا آپ نے جماعتِ اسلامی کے "صالحین" کی زبان سے، اِن حضرات (بریلوی یا دیوبندی) کے ان عقائد کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی سنا ہے؟ اور آپ سُن بھی کیسے سکتے ہیں۔ جب ان کے قائد (مودودی صاحب) کا ارشاد ہے کہ چونکہ ان لوگوں (احناف۔ یعنی دیوبندی اور بریلوی حضرات) کی پاکستان میں اکثریت ہے، اس لئے کتاب و سنت کی وہی تعبیر قابلِ قبول ہو سکتی ہے، جسے یہ درست قرار دیں؟

یہ ہے وہ اسلام جسے یہ حضرات پاکستان میں قانوناً رائج کرنا چاہتے ہیں!

اس سے اُن لوگوں کو بھی اپنے اعتراض کا جواب مل جائے گا جو کہا کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام ہر ایک کی مخالفت کیوں کرتا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس قسم کے عقائد و مسالک کی حمایت کیا کرے؟

وہ ہر ایک کی مخالفت نہیں کرتا —— وہ ہر اس عقیدہ یا مسلک کی مخالفت کرتا ہے، جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو، اور اس کا جذبۂ محرکہ خدا کا خوف، ناموسِ رسالتؐ کی شرم اور دینِ خداوندی کی حمیت ہے۔ جس میں کسی مصلحت یا منافقت کی گنجائش نہیں۔

واللہ علیٰ ما نقول شہید

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر اور جوابی لفافہ لکھنا نہ بھولئے۔ تاکہ جواب دینے میں تاخیر نہ ہو۔ (ادارہ)

شاہد عادل
(میانوالی)

نقد و نظر

اسلامی قانون کا پانچواں ماخذ؟

حکومتِ پاکستان نے اہلِ وطن کو پیش آنے والے مسائل پر اسلامی تحقیق کے لئے ایک ادارہ ــــ تحقیقاتِ اسلامی نامی قائم کر رکھا ہے۔ کبھی کبھی اخبارات میں اس کا نام آتا ہے، تو عامۃ الناس سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ اس پر انہیں مطمئن کرنے کے لئے ادارہ کی جانب سے اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کی جانب سے ایک نہایت بلند معیار کا اسلامی رسالہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ جس نے علمی دنیا کے سامنے جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تحقیقات پیش کر کے پاکستان کی دھاک بٹھا دی ہے۔ عوام بیچاروں نے بھلا یہ رسالہ کب دیکھا ہوگا ــــ راقم کے اندازے کے مطابق تو یہ شاید ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی نظروں سے بھی بہت کم گزرتا ہوگا۔ جن حضرات کی نظر سے یہ رسالہ گزرتا ہے، وہ اس امر کی گواہی دیں گے کہ اس میں عام طور پر مستشرقین کے مقالات شائع ہوتے ہیں یا ان لوگوں کے جو ان مستشرقین کے خوشہ چین ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر اسے مستشرقین کا رسالہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک اہم ملکی مسائل کا تعلق ہے اس رسالے میں انہیں ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی۔ مثلاً خاندانی منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت ہی کو لیجئے کہ حکومت کی جانب سے اس مثبت اسکیم پر کروڑوں روپے خرچ کرنے کے باوجود محض شرعی رکاوٹ کی وجہ سے اس کے مثبت نتائج سامنے نہیں آ رہے۔ لیکن پچھلے دس سال میں اس اعلیٰ معیار کے علمی رسالے میں اس موضوع پر ایک لفظ تک نہیں لکھا گیا۔

اس رسالے میں کیا کچھ شائع ہوتا ہے، ویسے تو غالباً عوام کو اس کی بابت کچھ بھی معلوم نہ ہوتا لیکن ادارہ نے اپنی دس سالہ سالگرہ کا جشن منانے کے موقع پر اپنے اس "اعلیٰ معیار" کے علمی رسالے سے ایک "اعلیٰ پایہ" کے تحقیقی مقالے کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، جس پر ایک نظر ڈالنے سے ادارہ کی اسلامی تحقیقات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے، اور اس کا عنوان ہے۔ "فقہ اسلامی اور قانونی ضرورت"[۱]۔ کتاب کا مواد پینسٹھ (۶۵) صفحات پر پھیلا ہوا ہے، جس کے شروع میں اسلامی قانون کے مختلف مباحث سے گفتگو کی گئی ہے۔ جہاں تک

۱؎۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اصل مسئلے کا تعلق ہے وہ کتاب کے صرف چار صفحات (ساٹھ تا تریسٹھ) میں بیان ہوا ہے۔ وہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے چار ماخذ۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس تو مشہور ہیں لیکن ان کے علاوہ ایک مزید پانچواں بھی ہے جسے فاضل مصنف نے قانونِ ضرورت کا نام دیا ہے؎ اس کی بنیاد انہوں نے مندرجہ ذیل آیت پر رکھی ہے۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ (البقرۃ ۱۷۳)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تم پر مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ مگر جو شخص از حد مجبور ہو، اور نہ خواہش کرنے والا اور نہ حد سے گزرنے والا ہو۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

معاملہ تو بڑا صاف اور سیدھا سا تھا کہ قرآن مجید جو اسلامی قانون کا یقینی ماخذ ہے، اس نے نہایت مجبوری (اضطرار) کی صورت میں یہ گنجائش بھی رکھی ہے کہ انسان حرام چیز استعمال کر کے اپنی جان بچا سکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر قسم کے محقق جب تک ایسی سادہ سی بات کو الجھا نہ لیں، ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ یہی کچھ فاضل مصنف نے کیا ہے کہ قرآن مجید کی اس استثنائی صورت کو لے کر اس پر اسلامی قانون کے پانچویں ماخذ کی پوری عمارت کھڑی کر دی ہے اور جس کا سہارا لیتے ہوئے ضرورت کے وقت مختلف اسلامی احکامات اور قوانین کی خلاف ورزی کی گنجائش پیدا کر دی ہے۔

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، فاضل مصنف کا عربی زبان کا علم کچھ واجبی سا معلوم ہوتا ہے، ورنہ وہ اپنا وقت اس کتاب پر ضائع نہ کرتے۔ دراصل معاملہ یوں ہوا کہ لنڈن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز (جہاں سے فاضل مصنف نے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی ہے) کے ایک پروفیسر مسٹر فٹز گیرالڈ نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اسلامی قانون کا ایک پانچواں ماخذ "قانونِ ضرورت" بھی ہے۔ جس کے تحت ضرورت کے وقت اصل اسلامی احکامات کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے؎۔ اس کے بعد وہ اپنی مستشرقانہ ذہنیت کے مطابق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم یہودی قانون کا چربہ ہے؎ لیکن جس آیت پر

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

کتاب کا انگریزی نام یہ ہے ISLAMIC JURISPRUDENCE & THE RULE OF NECESSITY & NEED, BY Dr MOHAMMAD MUSLEH-UD-DIN, PH.D, (LONDON) اور اس کی قیمت 9 روپے ہے۔

؎ ایضاً صفحہ ۴۳۔

؎ "LAW IN THE MID: EAST, VOL I" صفحہ ۱۴۲

پروفیسر صاحب اور فاضل مصنف اس کی بنیاد اٹھاتے ہیں، وہ اُسے پوری طرح سہارا نہیں تو پروفیسر صاحب اگلے صفحہ پر تسلیم کر لیتے ہیں کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق تقویٰ سے ہے اس لئے یہ اجتماعی کی بجائے انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمانوں نے شاذ و نادر ہی اس گنجائش سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ انہوں نے آرنلڈ کی کتاب "اسلامک فیتھ" کے حوالے سے تسلیم کیا ہے کہ ایسی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ مسلمان مرتے مرجاتے تھے، لیکن حرام چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے[1] فٹز گیرالڈ صاحب نے تو اتنی بات کہہ کر معاملہ ختم کر دیا۔ لیکن ان کے خوشہ چین (جنہوں نے غالباً ان کی معرفت ڈاکٹر کی ڈگری لینی تھی) نے اس استثنائی شرعی گنجائش کو اسلامی قانون کا پانچواں ماخذ ثابت کرنے کے لئے ایک پوری کتاب تصنیف فرما دی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں وہ یہ حقیقت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی قانون کا ماخذ صرف وحی الٰہی ہے۔ بہرحال وہ اپنے تجویز کردہ اسلامی قانون کے پانچویں ماخذ کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے علامہ ابن رشد کے اس قول کا سہارا لیتے ہیں:-

واختلافهم فى الخمر عند هو من قبل التداوى بها لا من قبل استعمالها فى التغذى ولذلك اجازوا للعطشان ان يشربها ان كان منهاديً۔

(بدایۃ المجتہد جلد اول صفحہ ۴۶۲)

(ترجمہ) فقہاء کے نزدیک اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ کیا شراب دوا کے لئے استعمال ہو سکتی ہے یا نہیں — جہاں تک اضطراری حالت میں اسے بطور غذا استعمال کرنے کا تعلق ہے انہوں نے پیاسے کو اس کے پینے کی اجازت دی ہے۔ بشرطیکہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہو۔

اس کے برعکس فاضل مصنف اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ پیاسے کے لئے مطلق شراب پینا جائز ہے۔ اور بعض فقہاء نے بیماروں کے لئے اُسے بطور دوا استعمال کرنا جائز قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۶۰)

چنانچہ اس طرح فاضل مصنف نے اسلامی قانون کا پانچواں ماخذ ثابت کرتے کرتے پرمٹ پر شراب پینے والوں کے لئے گنجائش پیدا کر دی ہے۔ اور ساتھ ہی یورپی ممالک میں شراب پینے کا جواز مہیا کر دیا ہے، جہاں عام طور پر بعض اوقات پینے کے لئے صاف پانی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

دیکھئے! کس طرح ایک انفرادی معاملے کو اجتماعی بنا کر فاضل مصنف نے مفاسد کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس کا سہارا لیتے ہوئے تو ہر اسلامی قانون کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو اس کتاب کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اس سے یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ مغربی

---

[1] "LAW IN THE MID: EAST VOL I" صفحہ ۱۰۳

ممالک میں اسلامی تحقیق کے لئے کسی نابغہ ذہن نوجوان کو بھیجنا قیمتی زرمبادلہ ضائع کرنا ہی نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے ملک و ملت کے لئے خطرناک بھی ہے۔ وہ سادہ سی بات جو ایک سطر میں کہی جا سکتی ہو۔ (یعنی اسلامی قانون کے یقینی ماخذ قرآن کریم نے اضطراری صورتوں میں استثناء کی گنجائش رکھی ہے) اسے پیچیدہ بنا کر اس پر ایک کتاب تصنیف کر دینا، کہاں کی علمی دیانت ہے؟

جس طرح فاضل مصنف نے ایک نیا ماخذ پیش کیا ہے۔ اگر یہی رَوچل پڑی تو پھر ماخذ ہی ماخذ رہ جائیں گے اسلامی قانون ختم ہو جائے گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم ان سب لایعنی بحثوں کو چھوڑ کر قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑ لیں، جیسا کہ خود فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے ابتداء میں یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلامی قانون کا ماخذ وحیِ الٰہی ہے۔ (صفحہ ۳)

مَیں نے کتاب کے ایک سو بائیس حوالوں میں سے صرف دو کو چیک کیا ہے۔ جن سے غلط استدلال کیا گیا ہے۔ اسی سے باقی گلشن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ ہے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا معیارِ تحقیق، جس پر اِس غریب قوم کے کروڑوں روپے غرق ہو رہے ہیں۔!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PTI PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

طاقت صحت

اور بھرپور توانائی کیلئے

ہمیشہ اوولٹین استعمال کیجئے!

OVALTINE

خالد برادرس۔ پی۔او۔بکس نمبر 8026 کراچی

منزل ہے کہاں تیری!

چوہدری عطاء اللہ
ایڈووکیٹ (ساہیوال)

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں حکیمِ مشرق کو بے ساختہ یاد آنے والی دِلّی کے مہاجر، کہ ان دِنوں پاکستان کی ایک اہم اور مصروف شخصیت ہیں، ۱۹۴۷ء میں اعلانِ آزادی اور تقسیمِ برعظیم پر بھارت کی راجدھانی میں خونِ مسلم کی ارزانی ہوئی تو خانماں برباد اور آشیاں ویران ہو کر نئے اُفق کی تلاش میں سرحد کے اس پار چلے آئے۔ اس گہوارۂ امن کی فضاؤں کی وسعتوں میں کچھ دنوں بال کشائی کے جوہر دکھایا کئے۔ لیکن جب امیدوں اور آرزوؤں کے چمنستان پر بہار کے باغبانوں کو صیّاد کا روپ دھارتے دیکھا، تو اپنے بال و پر سمیٹے، زمین بوس ہوئے اور ایک کونے میں دبک رہے۔ علمِ نجوم سے شغف تھا۔ پرشکستگی پر بھی نگاہیں آسمان پر اپنے مقدّر کے اُبھرتے ڈوبتے ستاروں کے تعاقب میں رہیں۔

اب سے دو ماہ قبل مجھے شرفِ ملاقات حاصل ہوا، تو موصوف سے میرا تعارف کراتے وقت میرے ایک عزیز نے میری اس بداعتقادی کا تذکرہ بھی کر ڈالا کہ مَیں انسانوں پر ستاروں کی گردش کے اثرات کا قائل نہیں اور علمِ نجوم کی صداقت اور افادیت پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ موصوف نے اس پر میری جانب نگاہِ استفسار سے دیکھا تو میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں! یہ اس لئے کہ خاک زندہ ہوں مَیں تابعِ ستارا نہیں! اختیار و ارادہ کے امتیاز سے محروم ہو کر جمادات و نباتات اور ادنیٰ درجہ کے حیوانات کی مانند زندانیٔ تقدیر بن جانا مجھے گوارا نہیں۔" حرفِ اقبالؒ کا میری زبان پر آنا دُکھتی رگ کو چھیڑنا بن گیا۔ فرمانے لگے۔ "ہاں، اقبالؒ ہی تو ہمارے مصائب کے بانی ہیں۔ اقبالؒ ہی نے تو برعظیم میں ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا اور مسلم سادہ کو اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ یوں قائم ہونے والی ریاست میں پھر سے حکومتِ الٰہیہ اور خلافتِ راشدہ کا دَور لوٹ آئے گا۔ لیکن رابع صدی کے تلخ تجربات نے اس خام خیالی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ پاکستان میں ہمیں سربلندی کی بجائے سرنگونی نصیب ہوئی۔ جو نظامِ حکومت صرف چند برس ہی قائم رہا اور جسے اصحابِؓ رسولؐ بھی آگے نہ چلا سکے، اُسے ازسرِنو

قائم کرنا آج کے مسلمان کے بس کا روگ نہیں۔" موصوف کے پائے کے شہری کی زبان سے پھسلتے ہوئے یہ جملے گویا تیر و نشتر تھے جو میرے سینے میں ترازو ہو رہے تھے۔ دل تھا کہ رنج و محن کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ بارے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے عرض کیا۔ جس تاریخ سے یہ مفروضہ سامنے لایا جاتا ہے کہ اسلام بحیثیت ایک نظامِ حکومت کے چند برس سے آگے نہ چل سکا، اسی تاریخ کے اوراق اس حقیقت کو نہیں چھپا سکے کہ اس مختصر سے دور میں تربیتِ انسان اور تکریمِ بنی آدم کا جو معیار قائم ہوا، آج کی متمدن اور مہذب حکومتیں اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی وہ صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے ادوارِ خلافت میں ایک تاریخ ساز انداز میں بڑھا پھولا۔ اور بعد میں جب اس میں رخنہ اندازی ہوئی تو اس کی بدلی ہوئی صورت میں بھی خیر کا پہلو صدیوں تلک نمایاں رہا اور اقوامِ عالم اس سے فیضیاب ہوتیں رہیں۔"

جیسا کہ ایسی گفتگوؤں میں بالعموم ہوتا ہے، موصوف آسانی سے اپنی رائے بدلنے والے نہ تھے۔ بات سے بات نکلتی رہی اور پھر موصوف کی برہمی کا سبب بھی ظاہر ہو گیا۔ پاکستان میں تشریف لانے کے بعد موصوف ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ اپنے بلند منصب کے فرائض نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے رہے۔ تا آنکہ مزید ترقی کا وقت آیا تو حکمرانوں کی سیاسی مصلحتیں ان کی راہ میں حائل ہو گئیں۔ ان کے حق کو علاقائی اور لسانی عصبیت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ناانصافی کے شکار افراد کی زبان پر حرفِ شکایت آ جانا تعجب انگیز بات تو نہیں۔ لیکن کسی فرد کا اپنی مظلومی کے واسطے سے اپنی ذات کو پھیلا کر یوں اجاگر کرنا کہ اس کے سامنے ملک و ملت کا وجود سکڑ اور سمٹ کر ایک بے حقیقت سی شے دکھائی دینے لگے، خود سب سے بڑی ناانصافی ہے۔ موصوف نے جن خیالات کا اظہار فرمایا یہ اندازِ فکر فقط ان کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ عکس ہے اس ذہن کا جو ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں کچھ عرصہ سے غیر قرآنی سیاسی اور معاشی نظریات کے ابلاغ سے فروغ پا رہا ہے۔

تاریخ کے جس بھیانک دور سے ہم گذر رہے ہیں، یہ دورِ معاشیات ہے۔ آج کا متمدن اور مہذب انسان محض ایک معاشی حیوان ہے۔ جس کی تمام تر تگ و دو کا مرکز و محور فقط معاش اور مسئلہ معاش ہے۔ اس کی علمی کاوش، اس کے حیرت انگیز سائنسی انکشافات، اس کے ضوابطِ قانون، اس کے نظریاتِ اخلاق، اس کی سیاست، اس کی صلح، اس کی جنگ، سب کے سب، اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ ہمارے اپنے یہاں کی صورتِ حالات، بھی دیگر اقوام و ملل سے مختلف نہیں۔ بلکہ وہ قومیں کہ ہم جن کی فقط نقالی کرتے ہیں انہوں نے تو معاشی حیوانیت کی سطح پر بھی اپنے آپ کو ایک نوع کے ضابطہ کا پابند بنا رکھا ہے۔ لیکن ہم تو خود کو ہر پابندی

سے آزاد سمجھتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ہر اعتبار سے فوضویت کا شکار ہے۔ اقبالؒ ایک مفکر تھے۔ اپنے قرآنی فکر کی روشنی میں انہوں نے ملت کے سامنے پاکستان کی تصوراتی ریاست کا نظریہ پیش کیا۔ برعظیم کے مسلمانوں نے قائداعظمؒ کی زیرِ قیادت اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی اور پاکستان کی نظریاتی ریاست عالمِ وجود میں آ گئی۔ ہماری تیرہ بختی کہ پاکستان کے قیام کو بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ قائداعظمؒ ہم سے جدا ہو گئے۔ ہمارے یہاں کے بولنے سیاستدانوں کو موقع ملا اور وہ غیر قرآنی تصورات لے کر آگے بڑھے۔ لیکن عوام کو فریب دینے کے لئے اسلام کا نام بھی ان کے ورد زبان تھا۔ فقط نام سے حقیقت تو نہیں بدلتی، تاہم فریب ضرور دیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی مسلمان فریب کھا گیا اور فریب کھائے جا رہا ہے۔ اس لئے کھائے جا رہا ہے کہ ؎

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادا

ہم فریب خوردہ شہری اور دیہاتی محرومیوں کا شکار ہیں تو اس میں قصور اقبالؒ کا ہے نہ جناحؒ کا، نظریۂ پاکستان کا ہے نہ اسلام کا۔ تاریخ کے اس مفروضہ کو درست بھی مان لیا جائے کہ بعض بلند مرتبہ شخصیتوں کے علی الرغم حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قائم فرمودہ نظام حضورؐ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد اپنی اصل صورت میں قائم نہ رہ سکا، تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کو از سرِ نو قائم کرنے میں کوئی شے ہمارے مانع آتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ایسا کرنے سے باز رہنا چاہیئے؟ قرآن میں تو ہمیں صرف ایک ہی ہستی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (۳۳/۲۱) ماضی میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی فرضی یا حقیقی ناکامی حضورؐ کے قائم فرمودہ نظام کو از سرِ نو رائج کرنے میں ہمارے سدِّ راہ نہیں ہو سکتی۔

ہم نے پاکستان اسی غرض کے لئے حاصل تو اسلام کے نام پر کیا، لیکن حقیقی اسلام جو قرآن کے اوراق میں محفوظ ہے۔ وطنِ عزیز میں آج بھی غریب الغربا ہے۔ ہمارے عوام تو اسلام سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن ہالاک اور مفاد پرست سیاستدان حقیقی اسلام کو ان تک پہنچنے نہیں دیتے۔ پیشوائیت اور سرمایہ داری ایسے سیاستدانوں کی ہمدرد اور معاون ہیں۔ وسائلِ ابلاغ ان کے قبضہ میں ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کی وہ وہ تعبیرات عوام کے سامنے لائی جاتی ہیں کہ ؎

کسی پتھر سے میں بیاں کروں تو صنم بھی کہدے ہری ہری

آج کے اس مختصر مقالہ میں پاکستانی سیاست اور معیشت کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر کیا جائے گا:۔

پاکستان کا آئین جو ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے ۱۹۷۳ء میں اتفاقِ رائے سے وضع کیا ہمارے سامنے ہے۔ اس آئین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کی روشنی

میں وضع ہوا ہے۔

۱۔ قرآن میں فرعون کی سرکشی کا ذکر ایک جگہ دو الفاظ ہوا ہے۔

"اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا۔ اور اس نے وہاں کے باشندوں کو گروہوں اور پارٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔) ۲۸/۴

اس سیاستِ فرعونی کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے یہاں کے آئین سازوں نے آئین کے آرٹیکل ۱۷ میں سیاسی گروہ سازی اور پارٹی بازی کی کھلی اجازت دے دی ہے۔

۲۔ عدالت میں جرم ثابت ہو جانے پر ملزم سزا کا مستوجب ٹھہرتا ہے۔ قرآن میں صرف ایک استثنائی صورت بیان ہوئی ہے کہ جس میں ملزم مجرم قرار پا جانے کے بعد بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ کہ مقتول کے ورثاء چاہیں تو وہ قاتل کو اس سے خون بہا لے کر یا اس پر احسان رکھ کر معاف کر دیں۔ بشرطیکہ وہ قتلِ خطا ہو، قتلِ عمد نہ ہو۔ "فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ م بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ط (۲/۱۷۸) ورنہ عام اصول یہی ہے کہ جرم ثابت ہونے پر عدالت سزا کا حکم صادر کرتی ہے اور اس میں مداخلت نہیں کی جا سکتی۔

آئینِ پاکستان نے مقتول کے ورثاء کے اس قانونی اختیار کو تو ساقط کر دیا۔ لیکن آئین کے آرٹیکل ۴۵ کے تحت صدرِ مملکت کو یہ اختیار دے دیا کہ گھناؤنے سے گھناؤنے جرم (بشمول جرمِ قتل) کے مرتکب اور عدالت سے سزا کے مستوجب قرار دیئے گئے مجرموں کو سزا پانے سے معافی دے دیں۔ ایسے غیر قرآنی اختیار کو عمل میں لانے سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انکار فرما دیا تھا۔

۳۔ قرآن کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی قانون کی بالادستی سے مستثنیٰ قرار نہیں دیتا۔ چنانچہ قرآن میں نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کروایا گیا۔ "اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵) لیکن ہمارے آئین کے آرٹیکل ۲۴۸ میں صدر اور گورنروں کو قانونِ فوجداری کی گرفت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

آئین سازوں کا بس چلتا تو شاید اِن زعماء کو خدا کے ہاں ہونے والی بازپرس سے بھی بچا لیتے۔

وقت کی تنگی کے پیشِ نظر انہیں تین مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، معاش یا روٹی کا مسئلہ، جو کہ انسانی زندگی کا ایک بنیادی مسئلہ ہے، اِس دور میں بوجوہ غیر معمولی اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ اسلام دینِ کامل ہے اور اس اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں کو محیط۔ لہٰذا ممکن نہ تھا کہ وہ معاش جیسے اہم مسئلہ میں ہمیں گومگو

کی حالت میں چھوڑ دیتا۔ اس کے بارے میں بڑی واضح ہدایات خدا کی کتاب میں موجود ہیں اور یہ بات بربنائے دلیلِ محکم کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کا پیش فرمودہ حل ہی اس مسئلہ کا بہترین حل ہے۔ انسان اپنے طور پر مسئلہ معاش پر جو کچھ سوچ سکا ہے اس کی آخری صورت سوشلزم ہے۔ اس نظام پر وارد ہونے والے منجملہ دیگر اعتراضات کے سب سے وزنی اعتراض یہ ہے کہ یہ نظام بہتر صلاحیتوں کے حامل افرادِ معاشرہ سے کم تر صلاحیتوں والے افراد کے حق میں جس ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرتا ہے اس کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ اس نظام میں نہیں پایا جاتا۔

ہمارے اپنے یہاں قرآن کی واضح ہدایات کے علی الرغم معاملاتِ معاش کو ایک نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ اس نزاع میں دو بڑے گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسلام پسندوں کا گروہ، (جو قرآنی اسلام کی بجائے کچھ اسلام کی بوالعجبیوں کے سہارے زندہ ہے) اس مسئلہ کا ایسا حل پیش کرتا ہے جسے حقیقی اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس گروہ میں جماعتِ اسلامی جس کا مذہب ہر مصلحت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، بہت نمایاں ہے۔ اس جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے حق میں قلم کا لٹھ گھمانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز مغالطہ آفرینی ان لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوتا، جو ان کی مخصوص ٹکنیک سے واقف ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری کی شعبدہ بازیوں کا دور بیت چکا ہے۔ اب تو سرمایہ دار بھی خود کو سرمایہ دار کہلواتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔ سرمایہ داری کے حامیوں کے مقابل سوشلزم کے پرستار روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کے مواعید کے ساتھ عوام کے سامنے آتے رہے۔ لیکن ہمارے یہاں کے محرومین اپنی محرومیوں کے باوجود ان کی طرف راغب نہ ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے سُن رکھا تھا اور درست طور پر سن رکھا تھا کہ سوشلزم کی بنیاد دہریت پر رکھی گئی ہے۔ غریب مسلمان کو اسلام، روٹی کپڑے اور مکان سے بھی عزیز تر ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانیوں نے بزعمِ خود ایک درمیانی راہ ڈھونڈ نکالی۔ انہوں نے اعلان کیا۔ "اسلام ہمارا مذہب ہے۔ جمہوریت ہماری سیاست، اور سوشلزم ہماری معیشت۔" اس پر بعض گوشوں سے اعتراض ہوا تو سوشلزم کے ساتھ "اسلامی" کا سابقہ لگا دیا گیا اور مذہب کی بجائے 'دین' کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ اسلامی سوشلزم کی تشریح طلب ہوئی تو اسے مساواتِ محمدی کہا جانے لگا۔ پیپلز پارٹی حکومتی جماعت ہے اور اس پوزیشن میں ہے کہ اپنے نظریات کو قانونی شکل دے سکے۔ لیکن گذشتہ تین چار میں جو کچھ ہوا ہے، اس میں اسلامی سوشلزم یعنی مساواتِ محمدی قسم کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ ذیل کی چند سطور میں تعلیماتِ قرآنی کی روشنی میں مساواتِ محمدی کی جھلک دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔

مساواتِ محمدی کے نفاذ کے لئے قرآن ہر پیروِ دعوتِ ایمانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی جان کے ساتھ اپنا مال بھی اللہ تعالےٰ کے حوالہ کر دے تاکہ اللہ تعالےٰ نے تمام انسانوں کو سامانِ پرورش

مہیا کرنے کی جو ذمہ داری بدیں الفاظ لے رکھی ہے۔ "نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ" (۶/۱۵۲) اسے پورا کیا جا سکے۔ جس معاہدہ کے تحت اللہ تعالےٰ انسان سے اس کی جان کے ساتھ اُس کے اموال بھی طلب کرتا ہے۔ اور اس کے عوض اُسے جنت کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن میں بدیں الفاظ آیا ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (۹/۱۱۱)

حکمران جماعت سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس معاہدہ کے نفاذ کے لئے اب تک تم کیا کر پائے ہو اور تمام افراد معاشرہ کو مکمل سامانِ نشو و نما مہیا نہ کر سکنے کا کیا عذر تمہارے پاس ہے۔

مساواتِ محمدی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں دولت کی ریل پیل کسی مخصوص طبقہ یا گروہ ہی میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ جس طرح ایک صحت مند جسم میں خونِ صالح کی گردش تمام اعضائے جسم میں بقدرِ ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح دولت کی گردش بھی تمام افرادِ معاشرہ میں باندازۂ حاجات ہوتی رہنی چاہیئے۔ لیکن تمہارے عہد میں تو دولت مندوں کی ایک نئی کھیپ اُبھر رہی ہے، جبکہ کل کے محرومین آج بھی محرومین ہی کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ مخصوص طبقوں میں یہ محرومین دولت کی ریل پیل دیکھتے ہیں تو مساواتِ محمدی کو اپنی معیشت کا پیمانہ قرار دینے والوں سے اس آیتِ قرآنیہ کا مفہوم پوچھتے ہیں۔ "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ" (۵۹/۷)

مساواتِ محمدی کا مفہوم اس آیتِ قرآنی سے بھی بخوبی عیاں ہے جسے حضرت علامہؒ نے اپنی ایک نظم میں "اشتراکیت" کے زیرِ عنوان موضوعِ بیان بنایا ہے۔ چاہو تو سُن لو:-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے وجہ نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ گفتار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار!
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار!
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ "قل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اگر تم سچ مچ پاکستانی معاشرے میں مساواتِ محمدی لانا چاہتے ہو تو بلا توقف "العفو" کو صورتِ عمل میں لاؤ۔ کسی کے پاس قرآنی پیمانوں کے مطابق جائز ضرورت سے زائد دولت نہ رہنے دو۔ اپنے پاس بھی نہیں تو قرآن میں بیان کئے گئے مساواتِ محمدی کے اور پہلو بھی تمہارے سامنے لانا۔ لیکن وقت کی تلخ دامن کھینچ رہی ہے۔ آج اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ تم حکمران فریق ہو اس لئے اس رعایت سے اپنی تاریخ کے اس دور کے ایک حکمران کے مساواتِ محمدی کے بارے میں کہے ہوئے

چند الفاظ تمہارے گوش گذار کرتا ہوں، جس دور کو دورِ خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ پر مسجدِ نبوی میں عین حالتِ نماز میں قاتلانہ حملہ ہوا اور صحابہؓ نے دیکھا کہ ان کے جانبر ہونے کی امید نہیں تو ان سے استدعا کی کہ اپنا جانشین نامزد فرما دیجئے۔ فاروقِ اعظمؓ نے نامزدگی سے احتراز کیا اور چھ حضرات کے نام لئے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں۔ کسی شخص نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا نام بھی لیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے سختی سے منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اپنے خاندان کے کسی شخص پر اس بوجھ کو ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ ایک عمرؓ ہی کے لئے اس کی جوابدہی کیا کم ہے کہ وہ اپنے کنبے میں سے دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈالے۔ میں نے اپنے کو اور اپنے متعلقین کو بہت سی آسائشوں سے محروم رکھا۔ پھر بھی خلافت کی ذمہ داریوں سے اگر اللہ کے دربار میں بلا ثواب اور بلا عذاب کے چھوٹ جاؤں تو سمجھوں گا کہ بڑا خوش قسمت ہوں۔

حضور! سنا آپ نے ایک حکمران کے لئے مساواتِ محمدی کیا معنی رکھتی ہے۔ معاشی اعتبار سے حکمران کو عوام پر کوئی برتری حاصل نہیں ہوتی، بلکہ حکمران اور اس کے خاندان کے افراد دوسروں کے مقابلے میں محرومی کا شکار بنے رہتے ہیں۔ کیا آپ کی کیفیت بھی اسی نوع کی مساواتِ محمدی سے ملتی جلتی ہے۔ اگر نہیں تو کیا مستقبل میں اپنی ذات اور اپنے افرادِ خاندان کے لئے اس نوع کی مساواتِ محمدی پسندِ خاطر ہو گی۔ اگر جواب نہیں میں ہے تو آئندہ مساواتِ محمدی کا نام نہ لیجئے گا۔ سوشلزم کی جانب ہی لوٹ جانا مفید ہو گا۔ چونکہ مساواتِ محمدی کی نسبت حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی سے ہے۔ اس لئے اطلاعاً عرض ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معیارِ زیست عام مسلمانوں سے بلند تر نہ تھا۔

مقالہ لکھا جا چکا تھا کہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اخبار پاکستان ٹائمز کا پرچہ میرے سامنے آیا۔ اس میں ایک خبر کی سرخی جمائی گئی تھی:

خبر کے متن میں ماضی قریب میں وزیراعظم بھٹو کے دو معتمد علیہ ساتھیوں اور پُرجوش حامیوں ملک غلام مصطفےٰ کھر اور مسٹر محمد حنیف رامے کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس کا احوال درج تھا۔ اس پریس کانفرنس میں پنجاب کے ان سابق حکمرانوں نے اقتدار سے علیحدگی کے بعد وضع کئے گئے اپنے چار نکاتی پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلامی سوشلزم نام کی کسی شے کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا اور کہ وہ اب قوم کو سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے تذکار کے عذاب سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ یاد رہے کہ جس سوشلزم کے ذکر و بیان سے قوم کو بچانے کی فکر اب ان اصحاب کے دامن گیر ہے۔ اسی سوشلزم کی برکات کا شمار انہیں کی زبان سے سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے تھے۔ اور اب یہ اس کے وجود ہی سے انکار کر رہے

ہیں ـــــ نہ جانے جو کچھ وہ اب کہہ رہے ہیں یا کہیں گے اس کے بے حقیقت ہونے کا انکشاف ان پر کب ہوگا!

شبِ گذشتہ اپنے خطاب میں مفکرِ قرآن نے سیکولرازم کے امام میکیاولی کی مشہور کتاب "THE PRINCE" کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، کہ اس کتاب میں ایک کامیاب حکمران میں دو صفات کا پایا جانا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ خوئے شیری اور صفتِ روباہی۔ نہ جانے ہمارے سیاستدانوں میں سے کتنوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ تاہم غیر شعوری طور پر ہی سہی، ان صفات سے انہوں نے اپنے آپ کو متصف ضرور کر رکھا ہے۔ اقتدار میں ہوں تو شیر کی مانند تو نہیں، بھیڑیئے کی طرح ضرور چیر پھاڑ میں مصروف رہتے ہیں، اور اقتدار سے محروم ہوں تو روباہی حربوں سے لیس ہو کر عجز و انکساری کے سے انداز میں عوام، غریب عوام کے مونس و غم خوار بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ جب تک پارٹی ساز اور پارٹی نواز جمہوریت ہمارے یہاں رائج ہے، ہمارا واسطہ انہیں بھیڑیوں اور لومڑیوں ہی سے پڑتا رہے گا۔ اس سے نجات کی ایک ہی راہ ہے کہ آئین میں سیاسی پارٹیوں کا وجود ختم کر دیا جائے اور رائے دہندگان کو ممبرانِ اسمبلی کی بازطلبی کا حق ـــــ (POWER TO RECALL) دیا جائے۔

ضرورت رشتہ

(۱)

میٹرک۔ پی، ٹی، سی۔ امورِ خانہ داری و سلائی، کڑھائی کی ماہر۔ اکیس (۲۱) سالہ دوشیزہ کیلئے موزوں، باروزگار رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت (بصیغۂ راز)

ا۔ ل۔ معرفت

(۲)

پانچویں جماعت پاس۔ سلائی، کڑھائی و دستکاری کی سند یافتہ تئیس (۲۳) سالہ دوشیزہ کے لئے موزوں، باروزگار رشتہ درکار ہے۔

خط و کتابت (بصیغۂ راز)

ا۔ ب۔ معرفت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ "ترلوز" نے رنگ پکڑنا شروع کر دیا

ہم نے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت فروری ۱۹۷۶ء) میں "راقمے صاحب کی ترلوزی مسلم لیگ" کے زیرِ عنوان جو شذرہ لکھا تھا، اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ (۱) مسٹر حنیف راقمے نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ مسلم لیگ کو سیکولر تنظیم بنانا چاہتے ہیں۔ (۲) راقمے صاحب نے دوسرے ہی دن اس سے انکار کر دیا۔ (۳) اس کے بعد، ان کی (سابقہ کابینہ کے) ایک (سابق) وزیر، ڈاکٹر محمد صادق ملہی کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ اس انٹرویو سے انکار، راقمے صاحب کی منافقت پر مبنی ہے۔ انہوں نے خود ان سے (ڈاکٹر ملہی صاحب سے کہا تھا کہ ہمیں مسلم لیگ میں اس عزم کو لے کر شامل ہونا چاہیئے کہ اسے سوشلسٹ اور سیکولر جماعت بنا دیا جائے ــــ ہم نے اس کے بعد کچھ نہیں لکھا، کیونکہ یہ راقمے صاحب اور ڈاکٹر ملہی صاحب کا "درونِ خانہ" کا معاملہ تھا جس سے "محتسب" کو واسطہ نہیں ہوتا۔ راقمے صاحب کا اس سلسلہ میں کوئی مزید بیان ہماری نظروں سے نہیں گذرا۔ لیکن اب ایک ایسی حقیقت سامنے آئی ہے، جس سے نظر آتا ہے کہ راقمے صاحب کے عزائم، مسلم لیگ پر اثر انداز ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

تحریک اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اور مسلم لیگ کے وجود کی وجہِ جواز، دو قومی نظریہ تھا۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ تھا کہ ایک ملک کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم، ایک قوم میں ضم نہیں ہو سکتے۔ مسلم، اپنے دین کے اشتراک کی بنا پر، ایک جداگانہ قوم ہوتے ہیں، اور غیر مسلم جداگانہ قوم، یہی اسلام کا نظریۂ قومیت ہے۔ اس کے برعکس، سیکولر نظریۂ قومیت یہ ہے کہ ایک ملک کے اندر بسنے والے تمام افراد (مسلم و غیر مسلم) وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم بنتے ہیں ــــ قومیت کے یہ دو نظریات، کفر اور اسلام میں حدِ امتیاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ اسی (اسلامی) نظریہ قومیت کی علمبردار جماعت ہے (یا تھی)

راقمے صاحب کے مذکورہ صدر انٹرویو کے بعد، لاہور میں مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس کی روئداد روزنامہ نوائے وقت کی ۲۹ جنوری کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی رُو سے اجلاس میں کہا گیا ہے کہ:۔

پاکستان کے قیام کا بنیادی نظریہ ہی یہی تھا کہ پاکستان کے تمام شہری،

کسی جبر کے بغیر ایک قوم میں ضم ہوں۔

اس سے "دو قومی نظریہ" ختم ہوا، اور اس کے ختم ہونے کے ساتھ ہی اس مسلم لیگ کا وجود ختم ہوا، جس کے علمبردار قائدِ اعظمؒ تھے۔ وطنیت کی بنیادوں پر "ایک قوم" کے نظریہ کے بطن سے سیکولرازم کس طرح جنم لیتا ہے۔ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۸ء میں) کہہ دیا تھا کہ:۔

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یک جا رہ سکتے ہیں تو میں بر وقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

حکیم الامتؒ کے انتباہ کا پہلا مرحلہ تو مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے مذکورہ صدر بیان سے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ راقمے صاحب کا اقتصادی پروگرام (سوشلزم) بھی اختیار کرے گی، تو اس کا لازمی نتیجہ لادینی ہوگا۔

ہم مسلم لیگ کے دیرینہ کار پرداز بزرگوں کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ وہ قائدِ اعظمؒ کے لئے نہایت بیش بہا سوغات لے کر اگلی دنیا میں جائیں گے!

ہمارے بعض دوستوں نے (از رہ تفنن) کہا کہ، دراصل بات یہ ہے کہ راقمے صاحب پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہو کر پچھتا رہے ہیں، اور اب اپنی واپسی کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ اس کے لئے وہ اپنی اس حسنِ کارکردگی کو بطور کفارہ پیش کر سکیں گے کہ آپ کو آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کی طرف سے کچھ خدشہ لاحق ہو سکتا تھا (کہ وہ قائدِ اعظمؒ اور اسلام کے نام پر عوام کو اپنے پیچھے نہ لگا لے)، سو لیجئے! جس نحیف و نزار لیگ کے آخری قطراتِ خون نچوڑ لینے کے بعد میں ادھر آ گیا تھا، اب اُسے تہ خاک دبا آیا ہوں ——— کہو! تم میری کون کونسی خدمات کو جھٹلاؤ گے؟

خدا کرے کہ ان کی جلد شنوائی ہو جائے، اور وہ، اور ان کے ساتھ یہ بدنصیب قوم ——— اس عذاب سے چھوٹے۔

۲۔ بڑوں کی بڑی باتیں

چین نے پاکستان کی امداد، کن کن مواقع پر اور کس کس انداز سے کی، اس کی ایک مثال، مسٹر (F. D. DOUGLAS) نے اپنے اس مضمون میں پیش کی ہے جو کراچی کے روزنامہ ڈان کی ۱۵ر جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ (مسٹر ڈگلس کے بیان کے مطابق) اپریل ۱۹۵۵ء میں بنڈنگ کانفرنس کا انعقاد بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ اس میں ان (۲۹) اقوام کے نمائندے

شریک ہوئے جو دنیا کی نصف آبادی سے زائد پر مشتمل تھیں۔ پاکستان کی نمائندگی مسٹر محمد علی بوگرہ کے حصہ میں آئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس میں وہ مسئلہ کشمیر پیش کر سکیں، جس کے لئے انہوں نے خاص اہتمام سے اپنی تقریر تیار کی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، اس کانفرنس کے چیئرمین تھے۔ ان کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ مسٹر بوگرہ مسئلہ کشمیر سامنے لانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس کی پیش بندی کے لئے پہلے ہی ایک تدبیر سوچ لی۔ کانفرنس کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے، انہوں نے کرسئ صدارت سے اعلان کر دیا کہ چونکہ کانفرنس کا ایجنڈا طویل طویل ہے اس لئے ابتدائی تقاریر کوئی نہیں ہوں گی۔

یہ سن کر مسٹر بوگرا بڑے افسردہ ہو گئے۔ مسئلہ کشمیر کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا کوئی موقعہ نہ رہا۔ چین کے نمائندہ مسٹر چو، این، لائی تھے۔ انہوں نے ساری بات بھانپ لی۔ خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھے اور نہایت دھیمی اور پُرسکون آواز میں کہا کہ "مسٹر چیئرمین! میں نے قریب پچیس منٹ پر مشتمل اپنی تقریر تیار کر رکھی ہے، جسے میں کانفرنس میں پیش کرنا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے پنڈت نہرو کی طرف دیکھا۔ پنڈت جی میں اس کی ہمت کہاں تھی کہ وہ چین کے نمائندہ کو نہ کہہ دیتے! وہ خاموشی سے اپنی نشست پر براجمان ہو گئے، اور مسٹر چو، این، لائی نے اپنی تقریر پڑھ سنائی۔

اس سے دیگر تقاریر کا راستہ کھل گیا، اور مسٹر بوگرا نے کشمیر کا مسئلہ کانفرنس میں پیش کر دیا۔

اسے کہتے ہیں، حسنِ تدبّر اور مخلصانہ دوستی!

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست　　در پریشاں حالی، و در ماندگی

۴۔ تیری آواز مکّے اور مدینے

پچھلے دنوں، وزیرِ اعظم بھٹو نے "ایشیا آبزرور" لندن کے نمائندہ کو لاڑکانہ میں ایک طویل انٹرویو دیا۔ جس کا متن، پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۲/ فروری کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ان میں سے ہم ذیل کا اقتباس بمسرت ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اس اسلامی ملک کی یگانگت اور سالمیت کے اسباب کیا ہیں، کہا:۔

> بعض لوگ اکثر پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم اس حقیقت کو کیوں دہراتے رہتے ہیں کہ ہم اسلام کے پیرو ہیں، جبکہ دیگر ممالک، مثل سعودی عرب۔ لیبیا۔ عراق۔ افغانستان وغیرہ میں بھی مسلمان بستے ہیں۔ (اور چونکہ ان کی مملکتیں الگ الگ ہیں، اس لئے) اسلام، تمام مسلمانوں میں وجۂ یگانگت اور وحدت نہیں قرار پا سکتا۔ (یہاں) بعض لیڈر کھلے بندوں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ پہلے پنجابی، پٹھان، سندھی اور بلوچی ہیں اور اس کے بعد مسلمان۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام بہت بڑا رشتہ،

اخوت و یگانگت ہے۔ اگرچہ مختلف مقامات اور مختلف زمانوں میں اُس کی کارفرمائی (ROLE) مختلف رہی ہے، اور مختلف ملکوں اور خطوں میں، اس کی اثر اندازی اور نتائج برآری پر تاریخی، معاشرتی اور دیگر عوامل اثر انداز رہے ہیں۔ بایں ہمہ، اس کا اخوت اور وحدت کا عالمگیر پیغام، ہر جگہ یکساں رہا ہے۔ مختلف ممالک میں اس کے اثر کی شدت اور دائرۂ عمل کا انحصار وہاں کے معاشرتی یا اضافی حالات پر رہا ہے۔ انہی عوامل کی وجہ سے مختلف ممالک میں اس کے ماحصل مختلف رہے ہیں۔ (مثلاً) انڈونیشیا اور ملائشیا میں اس کی کارکردگی کا انداز اور تھا۔ جنوبی ایشیا میں، جسے اب برصغیر کہا جاتا ہے، یہ، مسلمانوں میں غیر مرئی ذریعہ اتحاد و اختلاف بنا۔ بنا بریں اسلام کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیتے وقت، ضروری ہوگا کہ آپ مختلف ممالک کے معاشرتی۔ سیاسی احوال و کوائف کو پیشِ نظر رکھیں۔ نیز ان شخصیتوں کو بھی جو وہاں اسلام کی مشعل بردار تھیں۔ ہمارے ہاں اسلام، اپنے یوم ورود سے لے کر اب تک، مسلمانوں میں وجہِ جامعیت چلا آ رہا ہے۔ کسی خاص ملک میں اسلام نے کسی حد تک کامیابی حاصل کی، اس کا جائزہ لینے کے لئے ان تمام عوامل کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس سوال کا جواب اس سے زیادہ متعین اور وضاحت سے دیا جا سکتا تھا، لیکن مسٹر بھٹو نے جو کچھ کہا ہے وہ از بس غنیمت ہے۔ انہوں نے مستفسر کو بتایا کہ مسلمانوں میں اسلام ہی حقیقی وجہِ جامعیت قرار پا سکتا ہے۔ باقی رہا مستفسر کا یہ سوال (یا اعتراض) کہ اس وقت دنیا کے مختلف ممالک میں مسلمان بستے ہیں۔ ان میں اسلام وجہِ جامعیت کیوں نہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں اسلام، بہ حیثیتِ دین کارفرما کہیں نہیں۔ ہر جگہ اسلام، مذہب کی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ اسے بہ حیثیت دین، کارفرما ہونے کے لئے مملکت پاکستان کا وجود عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی اس کی حیثیت مذہب ہی کی رہی ہے۔ یہ دین کی حیثیت یہاں بھی ابھی تک اختیار نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھان۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی، اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود، ایک قوم (امتِ واحدہ) نہیں بن پاتے۔

یہ ہے اس کی اصل وجہ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "دین اور مذہب" کا یہ فرق خود ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اُس غیر مسلم صحافی کی سمجھ میں کیا آتا؟ اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بلند قرآنی فکر کی ضرورت ہے، جسے ہماری مذہبی پیشوائیت ابھرنے ہی نہیں دیتی۔

۴۔ اِسلام میں حزبِ اختلاف کا تصوّر

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے ترجمان، ماہنامہ "فکر و نظر" کی جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں، ڈاکٹر احمد حسن صاحب کے قلم سے، عنوانِ بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں پہلے یہ بحث کی گئی ہے کہ اسلام کا نظام مشاورتی ہے جس میں مختلف ارکان کو تنقید و احتساب کی غرض سے آزادئ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس بحث کے بعد وہ آخر میں جو نتیجہ پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ:-

> مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کے لئے حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

جس "اقتباس" کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ قرآن کریم کا اقتباس نہیں، حدیث کا اقتباس نہیں۔ وہ مغربی مدبر ارنسٹ باركر کی ایک کتاب کا اقتباس ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے کہ:-

> پارٹیاں خواہ دو ہوں یا زیادہ۔ اسمبلی میں حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف کی حیثیت سے دو طرف بیٹھیں گی۔

ارنسٹ باركر نے، مغربی نظامِ جمہوریت پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف کا وجود لازمی ہے۔ اور ہمارے مقالہ نگار اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ دو، باہم متخالف و متضاد گروہ، لازم و ملزوم ہیں۔ ہم ان سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا قرآن، حدیث یا خلافت راشدہ کے نظام میں، اس قسم کے متحارب گروہوں کا کہیں سراغ تک بھی ملتا ہے؟ قرآن کریم ایک اُمت کی تشکیل کرتا ہے، جس میں باہمی اختلاف کو وہ خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ حضور نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جو لوگ باہمی اختلاف پیدا کر لیں، ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی دور کی مجلسِ مشاورت میں تمام ارکان کو آزادئ رائے کا حق حاصل تھا۔ لیکن اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ یہ مجلس مستقلاً دو پارٹیوں میں بٹی رہتی تھی، جن میں سے ایک پارٹی صاحبِ اقتدار ہوتی تھی، اور دوسری اس کے برمقابل، حزبِ اختلاف۔ قرآن کریم کی رُو سے، اقتدار کا حق کسی ایک پارٹی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اقتدارِ مطلق تو خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے، اور اس کے عملی نفاذ کا فریضہ پوری کی پوری اُمت پر عائد ہوتا ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں حقِ حکومت کہتے ہیں) قرآن کریم کی رُو سے، احزاب تو دو ہی ہیں —— حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ حزب اللہ کو احزاب میں تقسیم کرنا، اُمت میں اختلاف اور دین میں تفرقہ پیدا کرنا ہے، جو قرآن کی رو سے سنگین ترین جرم ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو مغربی نظامِ جمہوریت، اسلام کی ضد ہے۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والے، سیکولر نظام

کے حامیوں نے تو مغربی نظام کو اپنانا ہی تھا۔ اور انہوں نے اپنایا بھی۔ لیکن امت کی اس سوختہ بختی کا کیا علاج کہ دین کے اجارہ دار اور اسلامی نظام کے علمبردار بھی اسے عین اسلامی قرار دے کر پھولے نہیں سماتے، اور اپنے آپ کو "حزبِ اختلاف" بلکہ احزابِ اختلاف کہلانے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہم ڈاکٹر احمد حسن صاحب سے واقف نہیں، لیکن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے ضرور اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ خدا کے لئے اپنی صحیح حیثیت کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔ اس ادارہ کا وجود اس لئے عمل میں لایا گیا ہے کہ وہ بعد از تحقیق حکومت کو بتائیں کہ ان کا فلاں فیصلہ یا اقدام، اسلام کے مطابق ہے اور فلاں اسلام کے خلاف۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حکومتِ پاکستان نے مغربی اندازِ جمہوریت اختیار کر رکھا ہے۔ دستورِ پاکستان میں بھی یہی نظام درج ہے۔ یہ دستور متفقہ طور پر منظور شدہ بھی ہے۔ لیکن اس سے کوئی غیر اسلامی مسلک، اسلامی تو نہیں ہو جاتا۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ حکومت کو بتائے کہ اس کا فلاں فیصلہ اسلام کے خلاف ہے، نہ یہ کہ اس کے غیر اسلامی اقدامات پر بھی اسلام کا لیبل لگا کر اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھیں۔ اسلام میں جو اس قدر خلافِ اسلام نظریات، تصورات، معتقدات، بلکہ مسالک و مشاربِ راہ پا کر مروجہ مذہب بن چکے ہیں، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی نے حکومتِ وقت کو خلافِ اسلام فیصلوں یا اقدامات سے نہ ٹوکا۔ اسلامی نظریاتی کونسل یا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی تو خود مملکت کے قائم کردہ ادارے ہیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ حکومت کو بتائیں کہ اس کے کون کونسے اقدامات خلافِ اسلام ہیں۔ لیکن اگر یہ ادارے بھی "مصاحبوں" کا سا انداز اختیار کر لیں تو پھر اسلام کا وہی حشر ہوگا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں ہوا تھا۔

مجلّہ "فکر و نظر" کی ایک ستم ظریفی اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس نے اپنے سرورق پر لکھ رکھا ہے:-

> ادارہ تحقیقاتِ اسلامی یا وزارتِ مذہبی امور کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان تمام افکار و آراء سے متفق بھی ہوں جو رسالہ کے مندرجہ مضامین میں پیش کی گئی ہوں۔ ان کی ذمہ داری خود مضمون نگار حضرات پر عائد ہوتی ہے۔

یعنی اس مجلّہ کا کام اتنا ہی ہے کہ جو کچھ اسے (مطابق یا مخالفِ اسلام) موصول ہو، وہ اسے من و عن اپنے ہاں چھاپ دے، اور اس طرح اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے ـــ کیا کہنے ہیں، اس "تحقیقاتِ اسلامی" کے؟

۵ - مصلحتی اسلام

قرآن کریم نے غلامی جیسی انسانیت سوز لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس کے اسی سحاب کرم کا نتیجہ ہے کہ اقوام متحدہ (U.N.O) نے اپنے چارٹر میں بھی غلامی کو بنیادی حقوقِ انسانیت کے منافی قرار دے دیا ہے اور دنیا کی تمام مہذب اقوام نے اپنے دساتیر میں بھی اسے خلاف قانون ٹھہرا دیا ہے۔ خود آئینِ پاکستان میں بھی یہ شق موجود ہے۔ لیکن اس بدنصیب ملک کے مفسرِ اعظم اسلام کے واحد اجارہ دار، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی "شریعت" اس باب میں کچھ اور کہتی ہے۔ ان کا ارشاد یہ ہے کہ :-

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔
(مودودی صاحب کی تفسیر۔ تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۳۴۰)

(۲) اس کی مصلحت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-
جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہو، اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دے دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔
(تفہیمات۔ جلد دوم۔ مطبوعہ اگست ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۳۲۳)

(۳) ان لونڈیوں سے نکاح کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ :-
نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کے لئے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بنا پر تو حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اسے حلال کیا ہے[۱]۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اسے حلال کرے تو اس میں کونسی کراہت کی بات ہے۔
(ایضاً صفحہ ۳۷۵)

(۴) انہیں فروخت بھی کیا جا سکتا ہے :-
اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے، اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے، اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل

[۱] مودودی صاحب کا "قانون" کہیئے۔ اللہ کے قانون نے تو سرے سے غلامی ہی کو ختم کر رکھا ہے۔ (طلوع اسلام)

کر دیتا ہے ...... اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوقِ ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے۔ تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کئے جاتے، اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے۔ (ایضاً ص ۳۲۳)

(۵) لونڈیوں کے بارے میں تعداد کی بھی کوئی قید نہیں۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آ سکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ جبکہ لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ (ایضاً ص ۳۲۴)

یہ ہے غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مودودی صاحب کا عقیدہ ـــــ بلکہ یوں کہیئے کہ ان کے نزدیک اسلام کے احکام! ـــــ چونکہ پاکستان میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ جس قسم کے جی چاہے عقائد رکھے اور اپنے "مذہب" کی کھلے بندوں تشہیر کرے، اس لئے ہم مودودی صاحب کو اس سے کیسے منع کر سکتے ہیں! ـــــ ہم تو اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان سے اپیل کریں کہ وہ خدا کے لئے اس قسم کے خلافِ اسلام عقائد کو اسلام کی طرف منسوب کر کے اُسے دنیا میں بدنام اور رسوا نہ کریں۔ لیکن اگر ان کا مشن ہی اسلام کو بدنام کرنا ہو، تو ہماری ان اپیلوں کا ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ بہرحال ضمنی بات تھی۔ جس مقصد کے لئے ہم نے اس تلخ حکایت کو چھیڑا ہے وہ اور ہے۔

گذشتہ نومبر کی بات ہے کہ لاہور میں "بنیادی حقوق انسانیت" کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں ایک اجتماع منعقد ہوا ـــــ اس میں مودودی صاحب نے بھی تقریر فرمائی، جس کا موضوع تھا۔ بنیادی حقوق ـــــ اسلام میں۔ ظاہر ہے کہ جب "انسانی حقوق" کا تذکرہ ہو تو اس میں غلامی کا ذکر ناگزیر ہو گا۔ جب مودودی صاحب اس نازک مرحلہ پر آئے تو انہوں نے فرمایا کہ:

اسلام میں جو غلامی رکھی گئی وہ صرف یہ تھی کہ اسیرانِ جنگ جو میدانِ جنگ سے پکڑے جائیں، اس وقت تک حراست میں رہتے جب تک ان کی حکومت، مسلمان قیدیوں کو نہ چھوڑتی یا فدیہ ادا نہ کرتی۔ اگر اس کے بعد بھی اسیرانِ جنگ مسلمانوں کے پاس رہ جاتے، تو بجائے اس کے کہ عورتوں کو طوائف بنا دیا جاتا اور مردوں کو کنسنٹریشن کیمپوں (اذیتی کیمپوں) میں رکھا جاتا، ان کو آبادی میں پھیلا دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر اکثر مسلمان ہو گئے۔

(رپورٹ مندرج ہفت روزہ الحدید۔ گجرات۔ مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۷۵ء)

"جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں" کے متعلق آپ مودودی صاحب کے اُس مسلک کو دیکھئے جو (ان کی تحریروں کی رو سے) پہلے درج کیا جا چکا ہے، اور اس کے بعد اس نظریہ کو جو اس اجتماع میں پیش کیا گیا۔ یعنی یہ کہ:-

اُنہیں آبادی میں پھیلا دیا جائے۔

انہیں لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کرنے۔ سپاہیوں کے ان سے لاتعداد اور بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کرنے۔ اور پھر انہیں فروخت کر دینے کی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ صرف یہ کہا گیا کہ انہیں آبادی میں پھیلا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں ایسے لوگ ہوں گے جو غلامی کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے ہوں گے۔ مودودی صاحب کی "حکمتِ عملی" کا تقاضا یہی تھا کہ اس بات کو گول کر دیا جائے ـــــ غلامی کے حق میں وہ کچھ لکھا جائے تاکہ قدامت پرست طبقہ میں مقبولیت حاصل ہو۔ اور ایسے اجتماعات میں بات گول کر دی جائے۔ تاکہ روشن خیال طبقہ میں بھی مقبولیت حاصل رہے۔

۴۔ سوچو! جرم کس کا ہے؟

(مولانا) عبدالرحیم اشرف کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے (ہفت روزہ) المنبر کے ڈائجسٹ ایڈیشن ـــــ بابت ۲۴ جنوری ۱۹۷۶ء میں، وزیرِ اعظم بھٹو کے اس انٹرویو کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے، جو انہوں نے، پیرس سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "لانوویل اوبزرویٹر" کی نمائندہ خصوصی ـــ کنیز مراد ـــ کو (غالباً) گذشتہ اکتوبر میں دیا تھا۔ اس میں حسبِ ذیل سوالات اور جوابات کی طرف، المنبر نے خصوصی توجہ مبذول کرائی ہے:-

س:- آپ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ آپ نامکمل اور ادھورے کام کرتے ہیں، مثلاً کسی حد تک زرعی اصلاحات کر دیں اور جزوی طور پر کاروبار اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل ختم کیا اور نہ سوشلزم ہی نافذ کی۔

ج:- میں پاکستان کو ایشیائی پرتگال نہیں بنا دینا چاہتا۔ یقین کیجئے کہ میرے لئے ایسا کرنا بالکل سہل اور آسان ہے۔ رجعت پسند ملاؤں کا طبقہ، سرداروں اور جاگیرداروں کا طبقہ، تاجر اور کاروباری طبقہ اور دفتری دنیا کا ایک حصہ بھی اس انتظار میں لگے ہوئے ہیں کہ میں کب کوئی قدم، سوچے سمجھے اٹھاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے انتہائی طور پر حقیقت پسندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں پاکستان کو ایک طرح کا نپولین کے نظام جیسا انتظام پیش کر چکا۔ یعنی میں نے اس علیحدگی پسندی

کی فضا ختم کر دی ہے، جس نے انتہائی بائیں بازو اور انتہائی دائیں بازو کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ مگر ابھی اس ضمن میں اور بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اہم اقدام سہج سہج اور بتدریج کیا جانا چاہیئے۔ ترقی بتدریج ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد میں آئندہ انتخابات میں ہر طرح سے نمٹ لوں گا۔

س :۔ مگر آپ کچھ مدت پہلے سوشلزم کا پرشار کرتے تھے، اور اب آپ جمہوریت کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔

ج :۔ میں کوٹھے کی چھت پر کھڑے ہو کر زور زور سے یہ نہیں چلانا چاہتا کہ ۔۔۔ مجھے پاکستان میں سوشلزم لانا ہے۔ میرے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں تو سوشلزم کی ضرورت صرف پاکستان ہی کو نہیں ہے بلکہ مغربی یورپ تک کو بھی ہے، جہاں سرمایہ دارانہ نظام ناکام ہوتا جا رہا ہے۔

اس اقتباس میں جو کچھ سوشلزم کے متعلق کہا گیا ہے، اس پر المنبر نے جو سخت تنقید کی ہے۔ جہاں تک "سوشلزم" کے خلافِ اسلام ہونے کا تعلق ہے، طلوع اسلام مسلسل اس کی وضاحت کرتا چلا آ رہا ہے، اور اس کی مخالفت میں وہ المنبر سے کسی صورت میں بھی پیچھے نہیں ——— بلکہ کچھ آگے ہی ہوگا۔ لیکن ہم مؤقر جریدہ المنبر (اور اس کی وساطت سے، اس کے ہم نوا حضرات) سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ مسٹر بھٹو جس قسم کا نظام یہاں لانا چاہتے ہیں، اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اگر آپ حضرات میں سچ سننے کی تاب ہو تو ذرا ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے۔

(۱) آپ حضرات نے مغربی اندازِ جمہوریت کو عین مطابق اسلام قرار دے کر ملک میں نافذ کرایا، اور اس پر شادیانے بجائے۔

(۲) مغربی اندازِ جمہوریت کی بنیادی شق یہ ہے کہ جو پارٹی اکثریت میں ہو، اُسے حکمرانی اور قانون سازی کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔

(۳) قوم نے انتخابات کے ذریعے ایک پارٹی کو اکثریت بنا دیا۔ اب اس پارٹی کو حقِ حکومت حاصل ہے۔ آپ اپنی قبول کردہ جمہوریت کی رو سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے۔

(۴) آپ کہہ سکتے ہیں کہ اکثریتی پارٹی کو یہ حق، دستور کے حدود کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوتا ہے اور دستور میں یہ شق موجود ہے کہ ملک کا نظام اسلامی ہوگا، اور اس کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

(۵) بجا اور درست! دستور میں بے شک یہ شقیں موجود ہیں۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جس دستور پر آپ حضرات نے متفقہ طور پر دستخط کئے تھے، کیا اس میں کوئی ایسی شق بھی رکھی گئی تھی جس کی رُو سے یہ فیصلہ کیا یا کرایا جا سکے کہ اکثریتی پارٹی کا فلاں اقدام، فلاں فیصلہ یا

خلاف قانون، اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف؟ اس میں کوئی شق ایسی نہیں۔ اس میں کسی ایسی اتھارٹی کا ذکر نہیں جو کسی متنازعہ یا مختلف فیہ معاملہ میں فیصلہ دے سکے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ آپ حضرات نے ایسی اتھارٹی تو دستور میں رکھی (یا رکھائی) نہیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اتھارٹی سمجھ لیتا ہے اور جس بات کے متعلق وہ سمجھے کہ وہ اسلام کے خلاف ہے، اس کے خلاف شور مچانا شروع کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو (یا ہم میں سے کسی کو) آئین اور قانون کی رو سے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ ہم مصر ہوں کہ جس بات کو ہم خلافِ اسلام سمجھتے ہیں اسے سب خلافِ اسلام سمجھیں۔ اگر آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ سوشلزم خلافِ اسلام ہے تو مسٹر بھٹو (یا کسی اور) کو بھی کہنے کا حق حاصل ہے کہ سوشلزم عین مطابق اسلام ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں یا آپ؟

اندریں حالات، اسے آپ حضرات کا تغافل کہئے یا سہوِ نظر کہ آپ نے تدوینِ دستور کے وقت اس اہم ترین شق کو نظر انداز کر دیا، اور جب آپ نے خود ایسا کیا ہے تو اب اس کا خمیازہ بھگتیے۔ اب شور مچانے سے کیا حاصل؟

لیکن ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ، نہ ان حضرات کے تساہل کا نتیجہ ہے نہ سہوِ نظر کا۔ دستور کو ایسا دیدہ دانستہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر دستور کی رُو سے اس قسم کی اتھارٹی مقرر کر دی جاتی (جو بہرحال عدالتِ عالیہ ہی ہو سکتی تھی) تو ایک تو ان حضرات کی اپنی اپنی اتھارٹی ختم ہو جاتی اور دوسرے ان کے لئے معاشرہ میں مذہب کے نام پر انتشار پھیلانے کا موقع نہ رہتا۔ اور ان کے سارے دبدبہ اور طنطنہ کا راز اسی انتشار میں ہے جو یہ حضرات مذہب کے نام پر برپا کرتے رہتے ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت آپ کو اگلی سطور میں مل جائے گا۔

مسٹر بھٹو سے کسی کو اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن اس بات سے تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا کہ وہ ایک نڈر لیڈر اور بے باک حکمران ہیں۔ لیکن اس قسم کے نڈر لیڈر اور بے باک حکمران کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:-

> (میرے لئے پاکستان کو ایشیائی پرتگال بنانا بالکل آسان اور سہل ہے، لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ) دجعت پسند ملاؤں کا طبقہ۔ سرداروں، اور جاگیرداروں کا طبقہ۔ تاجر اور کاروباری طبقہ اور دفتری دنیا کا ایک حصہ بھی اس انتظار میں لگے ہوئے ہیں کہ میں کب کوئی قدم بلا سوچے سمجھے اٹھاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے حقیقت پسندی سے کام لینا پڑتا ہے۔

سرمایہ داری۔ جاگیرداری۔ کاروباری طبقہ یا دفتری دنیا کی مخالفت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ اس سے نمٹ لینا مسٹر بھٹو جیسے سیاستدان کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ اصل سوال اس انتشار اور خلفشار

کا ہے ـــــ جو "رجعت پسند ملاؤں" کی طرف سے مذہب کے نام پر برپا کیا جاتا ہے۔ ملک کی اسّی - نوّے فی صد آبادی ان لوگوں کے حلقۂ اثر میں ہے، اور تاریخ عالم بالعموم اور پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ بالخصوص مسٹر بھٹو کی نظروں میں ہے جس کی رُو سے وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ اس طبقہ کی فساد انگیزیاں کس حد تک جا سکتی ہیں۔ یہی وہ احساس ہے جو گذشتہ پچیس سال، ہر حکمران طبقہ کے اعصاب پر سوار رہا، اور جس کی وجہ سے یہ سوختہ بخت ملک، تنزّل اور تباہی کے گڑھوں کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ یہ حکمران ایسے اندھے نہیں تھے، جو یہ بھی نہ جان سکتے ہوں کہ ملک کی ترقی، خوشحالی اور سرفرازی کے لئے کیا کیا اقدامات ضروری ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ لیکن جونہی وہ کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتے، انہیں "مذہب کے نام پر خلفشار" کے ہوّا سے خائف کر دیا جاتا۔ اور جو اس کے علی الرغم کوئی قدم اٹھا لیتا، اسے اپنے اس "کئے" کی سزا بھگتنی پڑتی۔ یورپ میں کلیسا نے کیا کچھ کیا، اسے چھوڑیئے۔ خود ہماری (مسلمانوں کی) تاریخ کو دیکھئے کہ اس ہزار سال کے عرصہ میں، اس طبقہ نے خود اپنے ملکوں اور مملکتوں کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا؟ اس اعتبار سے مسٹر بھٹو کا خدشہ قابلِ فہم ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ ان لوگوں کی شور انگیزیاں ان اقدامات کے خلاف ہوتی ہیں جو "فی الواقعہ اسلام" کے خلاف ہوں "فی الواقعہ اسلام" سے تو انہیں واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ یہ ہر اس اقدام کے خلاف شورش برپا کر دیں گے، جو ان کے اپنے خیالات اور نظریات کے خلاف ہو۔ خواہ وہ اقدام قرآن کریم کے مطابق ہی کیوں نہ ہو ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ یہ ہر اس اقدام کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کریں گے جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے، بلکہ خود ان کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ان کی طرف سے طلوع اسلام کی مخالفت کس طرح ہو رہی ہے؟ طلوع اسلام کا جرم اس کے سوا کیا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ ہر وہ نظریہ، عقیدہ یا مسلک جو قرآن کے خلاف ہو، اسلامی نہیں کہلا سکتا۔

۷۔ مولانا مودودی اور اُن کی پیروی کرنے والے کافر اور اُن سے ملاقاتیں کرنے والے گمراہ ہیں!

میانوالی ۲ ستمبر (نمائندہ جنگ) جمعیت علماء اسلام کے صدر مولانا غلام غوث ہزاروی نے میانوالی اور بھکر میں عام جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودی اور اس کی پیروی کرنے والے کافر ہیں۔ اور ان کے ساتھ بیٹھنے اور ملاقاتیں کرنے والے بھی گمراہ ہیں۔ انہوں نے مولانا مودودی کو چیلنج کیا کہ وہ ۵ منٹ عربی میں

تقریر کریں تو میں ۵ ہزار روپے انعام دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میری جماعت حکومت سے ہر ممکن تعاون کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ مولانا نورانی۔ پروفیسر غفور احمد اور مولانا مفتی محمود نے مرزا ناصر سے ایک سوال تک نہیں کیا۔ اور اگر انھوں نے ایک سوال بھی کیا ہو تو میں ایک ہزار روپے انعام دوں گا۔

(جنگ، کراچی ۴ ستمبر ۱۹۷۵ء)

۸۔ طوائفوں کو کیش میمو رکھنے کی ہدایت

کراچی ۲۷ جنوری (اپ پ) انکم ٹیکس کے محکمے نے انکم ٹیکس ادا کرنے والی طوائفوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا مناسب حساب کتاب رکھیں۔ وہ ملاقات کے لئے آنے والوں کو کیش میمو جاری کریں اور ملاقات کے لئے آنے والوں کے نام اور پتہ رجسٹر میں درج کریں نوٹس ملنے کے بعد درجنوں طوائفوں نے اس کے خلاف اپیل کی۔ طوائفوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان کی آمدنی کے سلسلے میں جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ مہینہ میں صرف تین ہفتہ کام کرتی ہیں۔ انکم ٹیکس حکام نے طوائفوں کو ہدایت کی ہے کہ انکم ٹیکس کی دفعہ ۱۳ کے تحت وہ رجسٹر اور کیش میمو بک رکھیں۔

طلوع اسلام | مذہب بے شک اسلام ہے، لیکن جب معیشت، سوشلزم ہو تو پھر حکومت کی اس قسم کی آمدنی پر اعتراض کیا کیا جا سکتا ہے؟

۹۔ مشتعل حاجیوں کا کسٹم ہاؤس پر حملہ

کراچی ۳۱ دسمبر (پ پ ا) مشتعل حاجیوں کے ایک گروہ نے کل کسٹم ہاؤس پر حملہ کر کے ان اشیاء کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی جو کسٹم حکام نے ضبط کر لی تھیں۔ کسٹم حکام کے مطابق ان حاجیوں نے سنگباری کی اور فرنیچر توڑ پھوڑ دیا۔ یہ حاجی حال ہی میں چار مسافر جہازوں کے ذریعے کراچی پہنچے تھے اور الیکٹرک کے سامان سمیت سامان تعیش اپنے ساتھ لائے تھے۔ چونکہ وہ زیادہ سے زیادہ دو سو روپے کی مالیت کا سامان ساتھ لا سکتے ہیں اس لئے باقی سامان ضبط کر لیا گیا۔ کلکٹر آف کسٹم مسٹر منظور احمد ضیاء نے حاجیوں کی شکایات کو ہمدردی سے سنا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ وزارت مذہبی امور سے رابطہ قائم کریں لیکن حاجیوں نے اس کے برعکس شور مچانا اور پتھر پھینکنا شروع کر دیا۔ جس سے کسٹم ہاؤس کی عمارت کو نقصان پہنچا۔

طلوع اسلام کلکٹر آف کسٹم کو غالباً معلوم نہیں ہوگا کہ یہ حضرات "حاجی" ہیں!

باب المراسلات

سزائے جرمانہ — ایک غور طلب سوال

ہمارے ایک رفیق، ایک اہم سوال پیش کرتے ہیں جو (بالخصوص قانون دان حضرات) کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دو نوجوان کسی مقدمہ میں ماخوذ ہوئے اور عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا دی۔ اور اس کے ساتھ پانچ پانچ ہزار روپیہ جرمانہ۔ بصورتِ عدم ادائیگی جرمانہ، مزید تین تین سال کی سزا — اقل تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ "عمر قید" کے بعد، مزید تین سال کی سزا کا کیا مطلب؟ کیا یہ سزا عمر ختم ہو جانے کے بعد وارد ہو گی۔ خیر! یہ تو جملہ معترضہ تھا — انہوں نے عمر قید کی سزا پوری کر لی۔ ان میں سے ایک قیدی، امیر آدمی کا بیٹا تھا، جس نے سزا ختم ہونے سے پہلے ہی جرمانہ ادا کر دیا۔ اور اس طرح وہ سزا ختم ہونے کے ساتھ ہی رہا ہو کر گھر آ گیا۔ دوسرے قیدی کے ماں باپ بہت غریب ہیں۔ نہ ان کے پاس جرمانہ کی رقم ہے۔ نہ کوئی ایسے وسائل یا جائداد جس سے وہ یہ رقم حاصل کر کے ادا کر سکیں۔ خود مجرم اتنے سال جیل میں رہا ہے۔ اس لئے کوئی کمائی نہیں کر سکا۔ اب ظاہر ہے کہ اسے مزید تین سال جیل میں رہنا ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ اس نوجوان کو مزید تین سال کی قید کس جرم کی پاداش میں کاٹنی پڑے گی؟ محض اس جرم کی پاداش میں کہ وہ غریب ماں باپ کا بیٹا کیوں ہے؟ جرم ان دونوں مجرموں کا ایک تھا۔ بنیادی سزا بھی یکساں تھی۔ (۱) دونوں نے بھگت لی۔ اس کے بعد ان دونوں میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو گیا — ایک رہا ہو گیا، اس لئے کہ وہ امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ دوسرا تین سال تک قید و بند کی مصیبتیں اٹھائے گا، محض اس لئے کہ یہ غریب ماں باپ کا بیٹا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غلط معاشرہ میں دولت بڑے بڑے جرائم کو چھپا دیتی اور بڑے بڑے عیوب کی پردہ پوشی کر دیتی ہے۔ لیکن زیرِ نظر مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں قانون کی رو سے غریبی، تین سال کی قید کا موجب بنتی ہے اور پھر لطف یہ کہ اس قیدی کو رہا بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ باہر جا کر کچھ کمائی کرے، اور اس سے جرمانے کی رقم ادا کر دے۔ اس کے لئے جیل میں بند رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ غلاموں کو بھی اس کی آزادی حاصل ہوتی تھی کہ وہ کمائی کر کے، اپنے مالک کو زرِ فدیہ ادا کر دیں اور اس طرح اس سے آزادی حاصل کر لیں۔ لیکن موجودہ صورت میں یہ بھی ممکن نہیں۔

کیا کوئی ماہرِ قانون اس پر روشنی ڈالیں گے کہ اس قسم کی سزا کی وجہِ جواز کیا ہے، باہم محض انگریز کے زمانے کی لکیر پیٹتے چلے آ رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کے تدارک کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

طلوعِ اسلام — اس کی وجہِ جواز خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ باقی رہی تدارک کی صورت، سو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ قانون میں مناسب ترمیم کی جائے۔

شاہد عادل
(سیالوالی)

دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس اور بھارت

دو سال قبل لاہور میں منعقد ہونے والی دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس بلاشبہ حکومتِ پاکستان کا شاندار کارنامہ تھا۔ جس کے، پاکستان کے حق میں بڑے خوشگوار نتائج ظاہر ہوئے۔ یہاں تک کہ بہت سے عرب اور اسلامی ممالک پاکستان کو اسلام کا قلعہ سمجھنے لگے۔ ہماری یہ کامیابی ہمارے دشمنوں، خاص طور پر بھارت کے لئے جس قدر تکلیف دہ ہو سکتی تھی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس کے انعقاد سے بھی پہلے، اس نے اس کانفرنس کے متوقع خوشگوار اثرات کا اندازہ لگا لیا تھا، اور انہیں ختم یا کم کرنے کی امکانی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

بھارت، کانفرنس کے انعقاد سے پہلے کی انہی کوششوں میں تو کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن بعد میں جب ہم اس کانفرنس کے مثبت نتائج کو عرب اور اسلامی ممالک میں مستقل کرنے کے کام سے غافل ہو گئے تو بھارت نے اس کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اور پچھلے دو سال کے عرصے میں اس نے حیرت انگیز طور پر عرب ممالک میں اپنا پہلا کھویا ہوا وہ مقام دوبارہ حاصل کر لیا جو قیامِ پاکستان کے بعد اس نے خصوصی منصوبہ بندی کے ذریعے حاصل کیا تھا، اور جو سقوطِ ڈھاکہ اور دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے نتیجے میں غیر مؤثر ہو گیا تھا۔ اس مختصر مضمون میں تمام عرب ممالک کی تفصیلات پیش کرنی ممکن نہیں، اس لئے ہم صرف ایک ایسے عرب کو لیتے ہیں جو ہمارا سب سے قریبی دوست ہے اور جہاں ہندوستان پہلے بھی اپنے قدم اچھی طرح نہ جما سکا تھا۔ اور اب بھی اس کے لئے ایسا کرنا نہایت مشکل تھا۔ ہمارا یہ دوست ملک سعودی عرب ہے۔ ان تفصیلات سے اس کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ دوسرے عرب ممالک میں بھارت کو کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہوگی۔

دوہرا سفارتی نظام

بڑی طاقتوں نے مختلف ممالک میں دوہرا سفارتی نظام قائم کر رکھا ہوتا ہے۔ ایک سرکاری سطح پر اور دوسرا غیر سرکاری سطح پر۔ بعض اوقات اس غیر سرکاری سطح کے نظام کو سرکاری سطح کے نظام سے بھی زیادہ فوقیت دی جاتی ہے —

اس لئے عام طور پر یہ خدمت زیادہ تر نسبتاً ذہین اور اسکالر قسم کے لوگوں کو سونپی جاتی ہے اور پھر ان دونوں کی جانب سے علیحدہ علیحدہ جو رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں، ان کی روشنی میں متعلقہ ملک کے بارے میں سرکاری پالیسی وضع کی جاتی ہے۔ بعض ترقی پذیر ممالک بھی حسب ضرورت اسی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہیں، اور ہندوستان ٹھیک انہی خطوط پر عرب ممالک میں کام کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک خصوصی ادارہ، انڈین کلچرل کونسل، قائم کر رکھا ہے۔ یہ کونسل عرب ممالک پر تحقیقی کام کرنے والے اہلِ علم پر نظر رکھتی ہے۔ خود اس مقصد کے لئے اس نے عربی زبان کا ایک بلند پایہ علمی رسالہ "ثقافت الہند" جاری کر رکھا ہے۔ جب یہ کونسل کسی عرب ممالک میں کسی خصوصی مشن کی ضرورت سمجھتی ہے، اس کے اہل اسکالر کو اس مقصد کے لئے وہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس دوہرے نظام کا ایک فائدہ تو ظاہر ہے کہ سرکاری سفارتی عملہ بھی چوکنا رہتا ہے اور کبھی غفلت سے کام نہیں لیتا، کیونکہ ان دونوں فریقوں کی رپورٹوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انہی منظم کوششوں کی بنا پر بھارت، عرب ممالک میں اپنا اسلامی تشخص قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض اوقات ہمارے عرب بھائی اور دوسرے مسلمان لیڈر بھارت کے حق میں اور پاکستان کے خلاف بیانات تک دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک راقم کی معلومات کا تعلق ہے، عرب ممالک میں ہمارا کوئی اسکالر اس قسم کی خدمات انجام نہیں دے رہا جو بھارتی مکاریوں کو بے نقاب کر سکے۔

ہندو ذہنیت کی بے نقابی

تاہم اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی کہ ہندو ذہنیت خود بخود عربوں کے سامنے بے نقاب ہو گئی۔ سقوطِ ڈھاکہ اگرچہ ہمارے لئے ایک عظیم قومی المیہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسے نتائج بھی نکلے جو ہمارے لئے سود مند ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ عربوں کے سامنے ہندو خباثت بالکل عریاں ہو گئی، اور انہوں نے ہندو ذہن کو اس کے اصل روپ میں دیکھ لیا۔ یہاں تک مصر اور الجزائر جو بھارت کے ساتھ تعاون میں پیش پیش تھے۔ وہ بھی بھارت سے اس حد تک متنفر ہو گئے کہ ۱۹۷۲ء میں ایک موقع پر ہندوستان کو دونوں سے اپنے سفیر واپس بلانے پڑ گئے۔ تاہم اس موقع سے بھی ہم نے کماحقہٗ فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر یہ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس پاکستان میں منعقد نہ ہوتی تو خطرہ تھا کہ اس وقت عرب ممالک میں ہماری حالت پہلے سے بھی دگرگوں ہوتی۔ اس لئے ہمارے لئے اشد ضروری ہے کہ ہم اس کانفرنس کے خوشگوار نتائج کو عرب ممالک میں مستحکم بنانے کے لئے پوری تندہی سے کام کریں۔

نمائشی مسلمان سفیر

بھارت نے سعودی عرب میں پُروقار مقام حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ وہاں ایک کانگریسی ذہنیت کے مسلمان اسکالر جناب ظہیر احمد کو اپنا سرکاری سفیر مقرر کیا۔ دوہرے سفارتی نظام کے اصول کے تحت علماء کی ایک جماعت علیحدہ ارسال کی۔ انہوں نے جس طریقے سے کام کرنا تھا، اس کے لئے سابق جنرل شاہنواز بنفسِ نفیس وہاں تشریف لے گئے۔ کیونکہ مسلم اوقاف کا انتظام ان کی نگرانی میں ہے ان دونوں فریقوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ وہاں کے حالات

کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی اسکیم وضع کریں جس سے سعودی عرب میں بھارت کا اسلامی تشخص ابھارا جا سکے۔ ان حضرات نے یہ متفقہ مشورہ دیا کہ بھارت بھی پاکستان کی طرح کسی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا انتظام کرے۔ ہندوستان میں اب لے دے کر" اولیاء اللہؒ کے سالانہ عرس منعقد ہوتے ہیں۔ عرب ممالک خصوصاً سعودی عرب کی دینی لغت میں عرس نامی سرے سے کوئی چیز ہی نہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دہلی میں "ہمدرد فاؤنڈیشن" کے قائم کردہ "ادارہ تحقیقات اسلامی" کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔۔ اس کے بعد راقم کو معلوم نہیں ہوا کہ کیا فیصلے ہوئے اور کیا منصوبہ بندی ہوئی۔ تاہم اس کے کچھ عرصہ بعد راقم نے عربی رسائل وجرائد میں یہ خبر پڑھی کہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں بھارت کی مشہور اسلامی درسگاہ "ندوۃ العلماء" کا عالمی پیمانے پر شاندار جشن منایا جائے گا۔ جس میں ساری عرب دنیا کے علماء کو شرکت کی دعوت دے دی گئی۔ راقم ابھی حیرت سے سوچ رہا تھا کہ یہ جشن کس موقع کی یاد یا خوشی میں منایا جائے گا کہ مراکش سے شائع ہونے والے مشہور عربی ماہنامے "دعوۃ الحق" کا جولائی ۱۹۷۵ء کا شمارہ ملا، جس کے صفحہ ۵۹ پر اس جشن کے بارے میں پوری تفصیلات بیان کی گئی تھیں، اور بتایا گیا تھا کہ یہ جشن دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاسیس پر پورے پچاسی (۸۵) سال گزرنے پر منایا جا رہا ہے۔

ندوۃ العلماء کا جشن

عام طور پر ایسے جشن کسی ادارے کی تاسیس پر پچیس (۲۵)، پچاس (۵۰)، پچھتر (۷۵) یا سو (۱۰۰) سال گزرنے پر منائے جاتے ہیں۔ ان مواقع پر تو ندوۃ والوں نے کبھی ایسے خیال کا اظہار نہ کیا تھا۔ اب ۸۵ سالہ جشن، ہمیں کچھ عجیب سا لگا۔ پھر ندوۃ العلماء کی تاسیس کے مختلف مرحلوں کو سامنے رکھا تو یہ "پچاسی سال" والا چکر کہیں پورا ہی نہ ہوتا تھا۔ مثلاً سب سے پہلے علماء کی ایک انجمن کے طور پر ندوۃ العلماء کا قیام ۱۸۹۳ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوا۔ اور مولانا محمد علی مونگیری کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء کا پہلا باقاعدہ اجلاس ۱۸۹۴ء میں مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں ندوۃ کا دستور العمل مرتب ہوا۔ ندوۃ کا دوسرا اجلاس اگلے سال، یعنی اپریل ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ جس میں ندوۃ کے تحت ایک دارالافتاء کے قیام کی تجویز منظور ہوئی۔ پھر ندوۃ العلماء کا تیسرا اجلاس ۱۱ اپریل ۱۸۹۶ء کو بریلی میں منعقد ہوا۔ جس میں دارالعلوم کا مسودہ باتفاق رائے منظور ہوا۔

۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے کہ اس دن دارالعلوم کی ابتدائی کلاسیں جاری کی گئیں۔ ندوۃ کی تاسیس کے سلسلے میں ان اہم تاریخوں کو سامنے رکھا جائے تو کسی کے ساتھ بھی پچاسی (۸۵) سال پورے نہیں ہوتے۔ اس لئے راقم کے ذہن میں کچھ شبہات سے ابھرے جن کی تائید بعد کے واقعات نے کر دی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ ناظم، سید ابوالحسن علی ندوی، ایک نہایت نیک اور مخلص مسلمان ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر رکھی ہے۔۔۔ ان

کے بارے میں تو سوچا ہی جا سکتا کہ وہ دیگر کانگریسی علماء کی طرح بھارت کی حکومت کے ہاتھوں میں کھیلیں۔ بلکہ جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں پر کوئی نیا ظلم ہوا، انہوں نے نہایت جرأت سے کام لے کر بھارتی حکومت کی مذمت کی۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چالاک قسم کے لوگ بعض اوقات مخلص لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور قرائن سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بھارتی حکومت نے بعض ایسے چالاک افراد کی خدمات حاصل کر کے اس جشن سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پھر عرب ممالک میں اس جشن کے سلسلے میں جس انداز سے پبلسٹی کی گئی، اس سے وہاں کے اہل علم کو بھی شبہ لاحق ہو گیا کہ اس جشن کے پیچھے حکومتِ ہند کے کچھ سیاسی مقاصد معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت سرانجام پا رہا تھا۔ اس لئے اس شبہ کے بارے میں حکومتِ ہند کو فوری اطلاع مل گئی اور پھر ہندو ذہن نے جس چالاکی اور صفائی سے اس شبہ کو رفع کیا، اسے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنہوں نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو۔ حکومت نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مسلمانوں پر مظالم کی وجہ سے حکومتِ ہند کی مذمت کرنے سے بھی نہیں ڈرتے، انہیں بھارت کا سب سے اعلیٰ علمی اعزاز عطا کرنے کا اعلان کیا۔ .....

..... حکومتِ ہند کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مولانا موصوف اس اعزاز کو کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ان کی دینی حیثیت کی موت کے مرادف ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مولانا نے بھارت کا یہ سب سے اعلیٰ نشان قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس اعزاز کے عطا کرنے کی خبر تو عرب ممالک کے رسائل و جرائد میں شائع نہ ہوئی۔ لیکن اس کے مسترد کرنے کی خبر وہاں کے اخبارات کے صفحہ اول پر شائع ہوئی۔ (اخبار العالم الاسلامی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۵ء ص۱)

قارئین جانتے ہوں گے کہ اپنے ملک کے اعلیٰ ترین اعزاز کو مسترد کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے، اور ایسے شخص کا جینا محال کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے جشن کے انتظامات کے سلسلے میں یو، پی کے گورنر سے ملاقات کا وقت مانگا، تو گورنر مسٹر بھوکنا، اپنے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر فوراً ندوۃ کی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ (ایضاً ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء ص۱)

مختصر یہ کہ بھارت کی اس چالاکی سے ندوۃ کے جشن کے بارے میں عرب ممالک میں سرکاری مقاصد کی غلط فہمی کسی حد تک دور ہو گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تاثر بھی پیدا ہو گیا کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا۔ چنانچہ اس تاثر کے ازالہ کے لئے بھارتی حکومت نے سابق جنرل شاہنواز کی قیادت میں علماء کا ایک لمبا چوڑا وفد سعودی عرب روانہ کیا۔ بظاہر تو اس وفد کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہندوستانی حاجیوں کے لئے انتظامات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن درپردہ وفد کے علماء نے وہاں کے علماء سے مل کر بھارت کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس منصوبے کے ایک حصے کے طور پر، بھارت کے نمائشی مسلمان صدر، جناب فخرالدین علی احمد نے اس سال فریضہ حج بھی ادا کرنا تھا۔ لیکن جنرل شاہنواز نے یہ اندازہ لگایا کہ پھل ابھی تک کچے ہیں اور ہندوستان کو سعودی عرب

میں جو بتدریج فوائد حاصل ہو رہے ہیں، بھارتی صدر کے دورے سے ان میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب صدر نے حج کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن عرب ممالک کے دورے کے بقیہ حصے کو انہوں نے پروگرام کے مطابق پورا کیا۔ جس کی تفصیلات آگے آتی ہیں۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء کے آخری ہفتے میں ندوۃ کے جشن کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں۔ یو، پی کے ہندو گورنر مسٹر بہوگنا گورنر ہاؤس سے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر جلسہ گاہ پہنچے، اور انہوں نے انتظامات کا جائزہ لیا۔ (ایضاً ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء ص۹)

عرب ممالک سے وفود آنے شروع ہوئے اور انہیں دریائے گومتی کے کنارے، لکھنؤ کے سب اعلیٰ اور مہنگے ہوٹل "کلارک" میں ٹھہرایا گیا۔ افتتاحی جلسے میں گورنر صاحب آخر تک موجود رہے، اس کے خاتمے پر تمام وفود کے اراکین کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ دوسرے دن یہ دعوت لکھنؤ کے معزز شہریوں کی طرف سے دی گئی، جو ایک قسم کی سرکاری دعوت ہوتی ہے۔ اور تمام اراکین کو یادگاری تحفے پیش کئے گئے۔ جن پر کلمۂ توحید کندہ تھا۔ (ایضاً)

عجیب بات ہے کہ ہندو اور کلمۂ توحید کے تحفے! ۔ سچ ہے سیاست انسان سے سب کام کراتی ہے۔

ہندوستان اور اسرائیل سے سفارتی تعلقات

اگرچہ اس جشن کے بارے میں بار بار یہ اعلان ہوتا رہا کہ یہ علمی نوعیت کا ہے۔ لیکن حقیقت کہاں تک چھپ سکتی ہے۔ چنانچہ قضیۂ فلسطین کے بارے میں اس جشن میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں بھارت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "ان الموقف الذی اتخذتہ الحکومۃ الھندیۃ برفضھا اقامۃ علاقات دبلوماسیۃ مع السلطات الیھودیۃ المحتلۃ لیدعونا الی شکرھا۔ (اخبار العالم الاسلامی، ۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء ص۱۳)
>
> (ترجمہ) حکومت ہند نے عرب علاقوں پر قابض یہودی حکومت سے سفارتی تعلقات قائم نہ کرنے کا جو مؤقف اختیار کیا ہے۔ وہ ہمیں پکارتا ہے کہ ہم اس امر کے لئے بھارتی حکومت کے شکر گذار ہوں۔

اس غلط بیانی سے چونکہ عربوں کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بھارت میں اسرائیل کا سفیر نہیں، لیکن بمبئی میں اس کا ایک قونصل خانہ موجود ہے، جس کی جانب سے ایک ماہنامہ (NEWS FROM ISRAEL) شائع ہوتا ہے۔ اسی کی معرفت ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر سے چھینا ہوا روسی اسلحہ، اسرائیل نے بھارت کو فروخت کر دیا تھا۔ چنانچہ اس اصطلاحی فرق کا فائدہ اٹھا کر ہمارے عرب بھائیوں کو خوب بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اور اس دفعہ یہ فائر جشنِ ندوۃ کے ذریعے کیا گیا۔ اگلے دن جمعیت علمائے ہند نے وفود کے اعزاز میں شاندار

ضیافت دی۔ ان دنوں جمعیت کے صدر مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے فرزند ارجمند شیخ اسعد مدنی ہیں۔ جشن کے ایک حصے کے طور پر اسلامی مخطوطہ کتابوں کی نمائش کی گئی۔ ان سب چیزوں سے وفود کے اراکین پر بھارت کے اسلامی تشخص کا ایک رعب سا قائم ہو گیا۔ جشن کے خاتمے پر تمام وفود کو دہلی کی سیر کرائی گئی۔ جہاں وہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے مہمان تھے۔ وفود جب اپنے وطن واپس لوٹنے لگے تو انہیں بمبئی کے پروفیسر آر۔ کے۔ عبداللہ کی تازہ انگریزی کتاب، شاہ فیصل شہید (THE MARTYRDOM OF THE MODERN CALIPH IN MAKING) کے نسخے پیش کئے گئے۔ اس سے مختلف وفود، خصوصاً سعودی عرب کے وفد کے اراکین کی خوشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رابطہ کے مذکورہ بالا ترجمان نے اپنی ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت کے صفحہ ۵ پر اس کتاب کا عکس شائع کر کے اس کی بڑی تعریف کی۔ جب یہ وفود اپنے وطن واپس گئے ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک عربی رسائل و جرائد میں بھارت کے اسلامی تشخص کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رابطہ کے زیرِ حوالہ ترجمان کے نومبر اور دسمبر کے آٹھ دس شماروں میں سے شاید ہی کوئی ایسا شمارہ ہو جس میں بھارت کے اسلامی تشخص کو نہ ابھارا گیا ہو۔ حالانکہ لاہور میں منعقد ہونے والی دوسری سربراہی کانفرنس، جو خود سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل مرحوم کے تعاون سے منعقد ہوئی تھی، اتنی تفصیل سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا تھا۔ فرق واضح ہے، کہ بھارت کی کامیابی زیادہ تر سرکاری سطح پر تھی، جبکہ بھارت نے زیادہ تر کامیابی غیر سرکاری سطح پر علماء کی مدد سے حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سال حج کے موسم میں مختلف کانفرنسوں میں بھارت کا پلہ بھاری رہا۔ جس کی کچھ تفاصیل ہم ابھی قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

بھارتی صدر کا دورہ

لیکن اس سے پہلے یہ بھی ملاحظہ ہو کہ اس زیرِ زمین کام کے ساتھ ساتھ ہندوستان سرکاری سطح پر بھی کس طرح پوری طرح سرگرم عمل رہا ہے۔ جنرل شاہنواز کے مشورے پر اگرچہ بھارتی صدر نے حج کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن اس نے دوسرے عرب ممالک کے دورے کا پروگرام برقرار رکھا۔ سب سے پہلے وہ ایک ہفتے کے دورے پر مصر پہنچے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ دوسری سربراہی کانفرنس میں شرکت حاصل کرنے کے لئے بھارت نے مصر کے صدر سادات کا تعاون حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ لیکن حالات جس ڈگر پر چل رہے تھے، ان میں صدر سادات کے لئے بھارت کی مدد کرنا ممکن نہ تھا۔ تاہم وہ کانفرنس کے خاتمے کے فوراً بعد اس بارے میں معذرت کرنے کے لئے دہلی پہنچے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے حکومتِ ہند نے ایک دفعہ پھر صدر سادات کا دامن تھاما۔ چنانچہ جن دنوں بھارتی صدر مصر کے سرکاری دورے پر تھے، ٹھیک انہی دنوں سعودی عرب کی سب سے زیادہ با اختیار شخصیت، یعنی ولی عہد شہزادہ فہد بن عبدالعزیز بھی تین دن کے دورے پر

قاہرہ پہنچ گئے۔ (ایضاً ۸ دسمبر ۱۹۷۵ء۔ صـ۲)

میرے اس اندازہ کی تائید بعد میں، روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ حج جناب لطیف آذر نے نوائے وقت کی تین جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں کی۔ انہوں نے لکھا کہ اس موقع پر شہزادہ فہد کے اچانک دورہ قاہرہ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ایسی نازک صورت حالات میں ہمارے سفیر کو حد درجہ چوکنا ہونا چاہیئے تھا کہ مجارق صدر کی عرب ممالک میں یہ یلغار واضح طور پر پاکستان کے خلاف تھی۔ لیکن وہ صاحب قاہرہ جانے کی بجائے جدہ تشریف لا چکے تھے اور حج ادا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ ظاہر ہے۔ اور اسی کی ہم ایک جھلک دکھاتے ہیں:۔

الندوۃ الاسلامیۃ العالیۃ کا چوتھا اجلاس

اس سال حج کے موقع پر مسلمانوں کی تین اہم عالمی تنظیموں کے اجلاس ہوئے۔ سب سے پہلے رابطہ کے سیکرٹریٹ میں رابطہ ہی کے زیر اہتمام الندوۃ الاسلامیۃ العالمیۃ کا چوتھا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بہت سے مسائل کے علاوہ، غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی حالت زار پر غور کیا گیا۔ بھارت کے چند نوجوانوں نے اپنا مسئلہ پیش کیا کہ خود ان کے اپنے ملک میں ان سے اچھوتوں جیسا سلوک ہو رہا ہے اور ان پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ ندوۃ کے لئے یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اسے حقائق کا پہلے سے علم تھا۔ اس لئے چاہیئے تو یہ تھا ہندوستان کی مذمت کی جاتی، لیکن الٹا ایسی قرارداد پاس کی گئی جو ہندوستان کے لئے مفید اور پاکستان کے لئے نقصان دہ تھی۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کامیابی کا اصل متن بھی قارئین کے سامنے لایا جائے۔

مطالبة الحكومات الاسلامية وخاصة الغنية منها.
بأن تستوفي حاجاتها من الخبرات والمهارات الفنية
والايدي العاملة من اقلياتٍ اسلامية۔

(اخبار العالم الاسلامی ۸ دسمبر ۱۹۷۵ء صـ۱۲)

(ترجمہ) یہ اجلاس اسلامی حکومتوں خصوصاً جو ان میں سے دولتمند ہیں۔ اپیل یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عام اور فنی ماہرین اور کاریگروں کی اپنی ضروریات ان ممالک کے مسلمانوں سے پورا کریں۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔

خیال رہے کہ اس وقت یہ ماہرین اور کاریگر زیادہ تر پاکستان سے اور ایک محدود پیمانے پر ہندوستان اور بنگلہ دیش سے جاتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فنی ماہرین اور کاریگروں کی ہمیں خود اپنے ملک کے لئے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن مذکورہ بالا قرارداد میں جو شر پنہاں ہے وہ تو واضح ہے۔ پھر اس اجلاس میں مسلمانوں کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کے بارے میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ لیکن مسئلہ کشمیر پر بحث کرنا تو کجا اس کا نام

تک نہ لیا گیا۔

مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس

انہی دنوں دوسرا اہم اجلاس مؤتمر عالم اسلامی کی ورکنگ کمیٹی کا منیٰ کے مقام پر ہوا۔ ایک پاکستانی بزرگ جناب انعام اللہ خان صاحب مدت العمر اس مؤتمر کے سیکرٹری جنرل رہے ہیں اور اسی وجہ سے اس مؤتمر کا سیکرٹریٹ بھی کراچی میں ہے۔ معلوم نہیں وہ اس سال بھی اس عہدہ پر فائز تھے یا نہیں، کیونکہ ان کا نام کہیں نہیں لیا گیا[1]۔ مؤتمر کا جب بھی کوئی اجلاس ہوتا تھا۔ اس میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں ضرور قرارداد پاس کی جاتی تھی۔ لیکن اس دفعہ یہ دیکھ سخت حیرت ہوئی کہ اسلامی دنیا کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن مسئلہ کشمیر کا نام تک نہ لیا گیا، حالانکہ مؤتمر نے اسپینی صحرا کے بارے میں مراکش کے حق میں جو قرارداد منظور کی اس سے کم از کم نصف درجن عرب ممالک کے ناراض ہو جانے کا خطرہ موجود تھا۔ مؤتمر کی دوسری قراردادوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید بھارتی وزارت خارجہ کے کسی افسر نے ان کے مسودے تیار کئے تھے۔ مثلاً بنگلہ دیش کے وفد نے مؤتمر کے سامنے اپنے ملک کی نازک صورت حالات پیش کی کہ بھارت کی جانب سے اس کی آزادی کو خطرہ ہے۔ اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی گئی، بھارت کی لابی نے اسے الٹا پاکستان کے خلاف استعمال کیا۔ چونکہ معاملہ اہم ہے اس لئے اس کا بھی اصل عربی متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

ولکن المجلس یَنْظُرُ بقلقٍ شدیدٍ الی التهدید الموجه لاستقلال بنغلا دیش مِنْ قبل بعض القوی۔

(اخبار العالم الاسلامی ۲۲ دسمبر ۷۵ء صفحہ ۱۳)

(ترجمہ) لیکن ورکنگ کمیٹی اس معاملے کو بڑے دکھ سے دیکھتی ہے کہ بنگلہ دیش کی آزادی کو بعض طاقتوں کی جانب سے خطرہ ہے۔

اگر اس قرارداد میں واضح طور پر ہندوستان کا نام دے دیا جاتا تو معاملہ صاف ہو جاتا اور ہندوستان کو اس ابہام سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا کہ بنگلہ دیش کو یہ خطرہ چین اور پاکستان کی جانب سے ہے۔ نہ کہ بھارت کی جانب سے جس نے اسے آزادی دلائی ہے۔

رابطہ العالم الاسلامی کی سترھویں کانفرنس

تیسری کانفرنس رابطۃ العالم الاسلامی کا سترھواں سالانہ اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں بھی حسب معمول اسلامی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر بحث کی گئی، لیکن مسئلہ کشمیر کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ نہیں کہ رابطہ والوں کو مسئلہ کشمیر کا علم نہیں۔ رابطہ کے سیکرٹری جنرل نے اجلاس کے سامنے جو پچھلی کارروائی پیش کی، اس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ رابطہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ مؤتمر کے سیکرٹری جنرل ابھی تک انعام اللہ خان صاحب ہی تھے۔ (طلوع اسلام)

قرارداد پاس کرتا رہا ہے۔ (ایضاً ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۹)

دوسری کانفرنسوں کی طرح ہندی مسلمانوں نے رابطہ کے اجلاس میں بھی اپنا معاملہ پیش کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رابطہ کا جو وفد ندوۃ العلماء کے جشن میں شریک ہو کر واپس گیا تھا وہ غالباً یہ تاثر لے کر گیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تمام معاملات ٹھیک ٹھاک ہیں۔ صرف جماعت اسلامی کے لیڈروں پر ہندوستان میں ظلم ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کے عنوان سے جو قرارداد پاس کی گئی اس میں صرف اس امر پر اظہارِ افسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں جماعت اسلامی کے لیڈروں کو قید کر کے ان پر سختیاں کی جا رہی ہیں، اس لئے قرار پایا کہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو اس سلسلے میں ایک تار ارسال کیا جائے۔ (ایضاً ۵ رجنوری ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۰)

اس قرارداد سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی ہند کے لیڈروں پر ظلم ہو رہا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے باقی کروڑوں مسلمان خیریت سے ہیں۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی سے راقم کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ وہ اس درجہ خود غرضی سے کام لے گی۔

حج وفود خیال رہے کہ یہ سارا کاروبار حالیہ حج کے موسم میں سرانجام پا رہا تھا۔ تقریباً تمام ممالک سے حج وفد سعودی عرب پہنچے تھے۔ اور رابطہ کے ترجمان نے ان کے فوٹو اور انٹرویو شائع کئے۔ یہاں تک کہ چاڈ جیسے چھوٹے سے ملک تک کے حج وفد کی تصویر بھی شائع کی — ہمارے ملک سے ایک کی بجائے دو وفد سعودی عرب گئے تھے! ایک پاکستان کا سرکاری حج وفد اور دوسرا کشمیر کا حج وفد۔ لیکن رابطہ کے ترجمان نے، جو نیم سرکاری حیثیت رکھتا ہے، ان وفود کا فوٹو یا انٹرویو شائع کرنا تو ایک طرف ان کے بارے میں کہیں معمولی سا اشارہ تک بھی نہیں کیا — اس کے برعکس پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کے نہ صرف یہ کہ فوٹو شائع کئے گئے بلکہ پورے پورے صفحے کے ان کے انٹرویو شائع کئے گئے۔

جمعیت کے لیڈر کی غلط بیانی جن حضرات کی عرب ممالک کے حالات پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے ان لیڈروں کے انٹرویو، یونہی نہیں چھپ گئے۔ جماعتِ اسلامی نے بھی ہندوستان کی طرح منصوبہ بندی اور بڑی محنت کے بعد عرب ممالک میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ اس لئے ہمیں رابطہ کے ترجمان سے یہ گلہ تو نہیں کہ اس نے ہمارے سرکاری حج وفود کے مقابلے میں جماعتِ اسلامی کے لیڈروں کو کیوں اہمیت دی۔ لیکن عرب ممالک میں اپنا مقام بنانے کے لئے وہ جس طرح غلط بیانی اور خود غرضی سے کام لیتے ہیں وہ مجموعی طور پر ملک و ملت کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسی اخبار کے ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے کے صفحہ ۱۸ پر جماعتِ اسلامی کی ذیلی تنظیم، اسلامی جمعیت الطلبہ کے ناظم عبدالملک مجاہد کا انٹرویو شائع ہوا۔ جس میں، اور باتوں کے علاوہ، یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلانے کا سہرا، انہی کے سر ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم ان کے دعوے کے اصل الفاظ ہی نقل کر دیں۔ فرماتے ہیں:-

اَلواقع أنّنا كما تعلمون أوّل مَن أعلن الحرب في وجه القاديانية في الباكستان
وهي الحرب التي انتهت باعلان تلك الفئة اقلية غير اسلامية (صفحہ ۱۸)

(ترجمہ) حقیقت یہ ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم ہی پہلے وہ لوگ تھے جنہوں نے پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف لڑائی لڑی اور ہماری یہی لڑائی انہیں ایک غیر اسلامی اقلیت قرار دینے پر ختم ہوئی۔"

یہ انٹرویو جماعت اسلامی کی ایک دوسری مشہور شخصیت پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مشورے اور چھان پھٹک کے بعد شائع کیا گیا۔ خود پروفیسر صاحب کا اپنا علیحدہ مفصل انٹرویو اخبار مذکور کے اگلے شمارے میں شائع ہوا۔

پاکستان میں مجلس تحفظِ ختم نبوت اور دوسرے ادارے جنہوں نے اس سلسلے میں جانی و مالی قربانیاں دی ہیں۔ اس دعوے کو پڑھ کر معلوم نہیں کس ردِعمل کا مظاہرہ کریں گے؟ ۱

جمعیت الطلباء کے ناظم صاحب نے دوسری غلط بیانی یہ کی کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کی انجمن ہائے طلبہ کے اسی فیصد اراکین ان کی جمعیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے سیکڑوں کالجوں میں جمعیت کا نام و نشان تک نہیں اور کراچی یونیورسٹی جو ان کا گڑھ سمجھا جاتا رہا ہے، وہاں بھی یہ ناکام ہو چکی ہے۔۲ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ عرب ممالک کی دینی جماعتیں خاص کر رابطۃ العالم الاسلامی نے ان جماعتوں پر اپنا اعتماد قائم کر رکھا ہے۔ جو زیادہ تر ان کے منظم پروپیگنڈہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ اس قسم کی طمع سازی مستقلاً دنیا کو فریب میں نہیں رکھ سکتی۔ جھوٹ ایک نہ ایک دن بے نقاب ہو کر رہتا ہے۔ پھر یہ تو ایسی غلط بیانیاں تھیں جو تحریر میں آسکتی تھیں۔ لیکن بعض ایسی تھیں جنہیں صفحۂ قرطاس پر نہیں لایا جا سکتا۔ خاص طور پر جناب طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی کو حج پر جانے سے روکنے کے بارے میں حکومت پاکستان کے خلاف جو شرمناک پروپیگنڈہ کیا گیا، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا انہیں یہ معمولی سا ذاتی فائدہ ضرور ہوا ہوگا کہ رابطہ نے جماعت کے ان اراکین کو سرکاری مہمان بنا لیا۔ لیکن اس سے ملک کو جو نقصان پہنچا۔ اس کا انہیں قطعاً احساس نہ ہوا۔ اس سال حج کے موقع پر پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کے چھا جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ معلوم نہیں ہمارے ہاں کے سفارت خانے نے اس سلسلے میں کوئی رپورٹ بھیجی ہے یا نہیں۔ تاکہ کم از کم آئندہ کے لئے اس کا کوئی تدارک کیا جا سکے۔

حرفِ آخر

ان تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ عرب ممالک خاص طور پر سعودی عرب میں ہماری حکومت کو صرف سرکاری سطح کے سفارتی تعلقات سے مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے۔ بلکہ بھارت کی طرح مناسب منصوبہ بندی کے تحت ان ممالک کے حالات سے باخبر اسکالروں کی خدمات بھی حاصل کرنی چاہئیں جو غیر سرکاری طور پر حکومت پاکستان کے مفاد میں وہاں کے اہلِ علم کے درمیان کام کریں تاکہ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے نتیجے میں ہمیں جو مقام حاصل ہوا ہے اسے مستحکم بنایا جا سکے۔ ورنہ جس منصوبہ بندی سے ہندوستان عرب ممالک میں کام کر رہا ہے اور جیسے ہمارے اپنوں کی ذاتی خود غرضیوں کی وجہ سے تقویت مل رہی ہے، اس سے تو یہی خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں وہ ایک دفعہ پھر ہمارے عرب بھائیوں کو ہم سے دور رکھنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

۱۔ اس جماعت کے منظم پروپیگنڈے نے کسی جماعت کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ ان کے کسی اقدام کے خلاف کسی ردِعمل کا مظاہرہ کر سکے۔ بعینہٖ یہی صورت، کمیونسٹوں نے جرمنی میں پیدا کر رکھی تھی۔ (طلوع اسلام) ۲۔ لیکن جب انہیں ان کے قائد کی طرف سے یہ تلقین مل چکی ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے تو پھر یہ لوگ ایسا کیوں نہ کریں۔ (طلوع اسلام)